Registered No. L. 4186

جلد ۲۸

عدد ۱

محرم ۱۳۶۵

۸۶ ج

ماھنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

دارالاسلام جمال پور۔ پٹھانکوٹ

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ۸ آنے

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اُن مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کیگئی ہے جنکے متعلق آجکل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔ حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد (سے ؑ) علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

فہرست مضامین

جلد ۲۸	بابتہ ماہ محرم ۱۳۶۵ھ مطابق دسمبر ۱۹۴۵ء	عدد ۱

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام متصل پٹھانکوٹ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

جماعت اسلامی کے نصب العین کی کامیابی کا تمام تر انحصار صحیح دعوت و تبلیغ پر ہے لیکن تبلیغ کا لفظ سنتے ہی قدرتی طور پر آدمی کا ذہن ان تدبیروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو مدتوں سے مسلمانوں میں تبلیغ دین کے لیے رائج و مقبول رہی ہیں۔ ایک زمانہ دراز کا تعامل جب کسی کام کے لیے کسی طریقہ کار کو متعین کر دیتا ہے تو دلوں پر اس کا ایسا سکہ بیٹھ جاتا ہے کہ لوگ اس سے علیحدہ ہو کر کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ وہ طریقہ اس کام کے انجام دینے کا بالکل قدرتی ذریعہ خیال کیا جانے لگتا ہے اور جو شخص بھی اس کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے وہی طریقہ اختیار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات آدمی اس سے بچنے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلتا ہے لیکن پھر چلتے چلتے پاؤں آپ سے آپ اسی پٹے ہوئے راستہ پر پڑ جاتے ہیں جس سے بچنے کا ارادہ کر کے وہ گھر سے نکلا تھا۔ ہم کو اکثر اس صورت حال کا تجربہ اپنے رفقاء میں ہوا۔ ہم نے وقتاً فوقتاً اس کے متعلق ہدایات شائع کر کے اس کی اصلاح کرنی چاہی لیکن بار بار کے تجربات نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ جو غلطیاں مدتوں کی مشق کے بعد پختہ ہو جاتی ہیں اجمالی تنبیہات سے ان کی اصلاح ناممکن ہے۔ اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ جس طرح پوری وضاحت کے ساتھ ہم نے یہ بتا دیا ہے کہ ہم اسی دعوت کو لے کر اٹھے ہیں جس کو لے کر حضرات انبیائے کرام علیہم السلام آئے تھے اسی طرح تفصیل کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیں کہ اس دعوت کو دنیا میں پھیلانے کا صحیح طریقہ جو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے اختیار کیا وہ کیا ہے؟ تاکہ ایک طرف ہمارے رفقاء کو دعوت و تبلیغ کا صحیح طریقہ معلوم ہو جائے اور دوسری طرف ان حضرات کی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں جو محض اس وجہ سے کہ ہم نے ان کے اختیار کیے ہوئے طریقوں میں سے کسی طریقہ کو پسند نہیں کیا، سمجھتے ہیں کہ ہم نہ تو تبلیغ کر رہے ہیں اور نہ تبلیغ کی ضرورت کے قائل ہیں۔

پہلے ہم تبلیغ کے مروجہ طریقوں کی غلطیوں کی طرف بالاجمال اشارہ کریں گے اس کے بعد تفصیل کے ساتھ۔

انبیائے کرام کے طریقۂ دعوت کی تشریح کریں گے۔ مروجہ طریقوں میں، ہمارے نزدیک دو طرح کی غلطیاں ہیں۔ علمی اور عملی۔ جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ طریقۂ تبلیغ اپنے فلسفہ کے اعتبار سے بھی غلط ہے اور طریقۂ کار کے پہلو سے بھی غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تبلیغ اسلام کے نام سے اب تک جتنی جدوجہد بھی کی گئی وہ مشترکہ صرف یہ کہ اصل مقصد کے لحاظ سے لاحاصل رہی بلکہ اس سے اسلام کی دعوت کو سخت نقصان پہنچا۔ ہم پہلے اس طریقہ کی علمی غلطیوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

---

(۱) سب سے بڑی غلطی جواب تک اسلام کو پیش کرنے میں کی گئی وہ یہ ہے کہ پیش کرنے والوں نے اپنا اور اسلام کا صحیح موقف نہیں سمجھا اور اسلام کو اس حیثیت سے نہیں پیش کیا جس حیثیت سے اس کو قرآن نے پیش کیا تھا۔ قرآن نے اس کو اس حیثیت سے پیش کیا تھا کہ ہمیشہ سے خدا کا دین یہی ہے۔ جب کبھی اور جس قوم میں بھی خدا نے اپنے کسی نبی کو بھیجا اسی دین کے ساتھ بھیجا۔ قومیں خدا کے بھیجے ہوئے دین میں برابر خرابیاں پیدا کرتی رہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کے ذریعہ سے ان خرابیوں کی اصلاح کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے اپنے آخری رسول کے ذریعہ سے اپنے تمام نبیوں اور رسولوں کے اس دین کو بالکل صحیح اور مکمل صورت میں نازل کر کے اس کو ہمیشہ کے لئے ہر طرح کی آمیزش اور تبدیل و تحریف کے خطرہ سے محفوظ کر دیا۔ یہ دین قرآن مجید کی صورت میں محفوظ ہے۔ یہ کسی خاص قوم کا دین نہیں ہے بلکہ تمام بنی نوع آدم کا دین اور خدا کے تمام نبیوں کا لایا ہوا دین ہے۔ جو اس کو مانے وہ مسلم ہے اور جو نہ مانے وہ غیر مسلم ہے۔ یہ نہ تو خدا کے کسی رسول کی تکذیب کرتا نہ اس کی کسی کتاب کا انکار کرتا، نہ کسی پر اپنی مطلق فضیلت کا مدعی ہے، اس کا دعویٰ صرف یہ ہے کہ یہ تمام گذشتہ نبیوں کی تعلیم کا قابل اعتبار مجموعہ ہے اور ان کی تعلیموں کو مکمل کرتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس ہمارے مبلغوں اور مصنفوں نے اس کو مسلمانوں کے دین اور تمام ادیان کے ایک حریف کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس کی سچائی ثابت کرنے کے لیے دوسری آسمانی کتابوں کی تعلیموں کا مذاق اڑایا اور بسا اوقات اس جوش میں اس قدر حد سے بڑھ گئے۔ ان کی ان تعلیمات کا بھی مذاق اڑایا جن پر ایمان لانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری بحیثیت مسلم اور تمام انبیاء کے مصدق ہونے کے خود ان پر عائد ہوتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کا مقابلہ کر کے ان کو ہیٹا دکھانے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ قرآن مجید میں اس طرح کی مطلق ترجیح و تفضیل کی صریح ممانعت کی گئی تھی اور یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اللہ تعم

نے اپنے ہر پیغمبر کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت دی ہے اور آنحضرت صلعم کی فضیلت کے جو پہلو تھے وہ تعین کے ساتھ واضح کر دیے گئے تھے اور خود حضور نے تاکید کے ساتھ ممانعت فرمائی تھی کہ دوسرے انبیاء کے مقابل میں آپ کے لیے مطلق فضیلت کا دعویٰ نہ کیا جائے۔ لیکن مسلمانوں نے اسلام اور پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اندھی بہری عصبیت قومی کے جوش کے ساتھ پیش کیا اور اس غلطی کا ارتکاب صرف عام واعظوں اور مبلغوں نے ہی نہیں کیا بلکہ ہمارے اُن بڑے بڑے مصنفین و مؤلفین نے کیا جن کی کتابیں مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لیے اسلام کے سمجھنے کا واحد ذریعہ تھیں۔ آپ اپنے تمام بڑے بڑے مصنفوں کی وہ کتابیں اٹھا کر دیکھیے جو اسلام پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں دوسرے انبیاء اور ان کی تعلیمات کی نسبت ایسے زہر آلود فقرے آپ کو ملیں گے جن کو پڑھ کر روح کو اذیت ہوتی ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان بھی تفریق بین اللہ والرسل کی اسی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں جس میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے اس طرح کی کتابوں کو عزت و احترام کے ہاتھوں لیا اور اس طرح کے واعظوں کی تقریریں داد و تحسین کے ساتھ سنیں کیونکہ اس سے ان کے قومی کبر و غرور کو شہ ملتی ہے۔ برعکس اس کے جن لوگوں کی تحریروں اور تقریروں میں یہ چاشنی نہیں ہوتی وہ نہ تو عوام ہی میں کچھ حسن قبول حاصل کرتے نہ خواص ہی میں ان کی کچھ بہت وقعت ہوتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ زہر آلود تبلیغی لٹریچر پیدا کرنے میں بہت کچھ دخل ان لوگوں کو بھی ہے جنھوں نے اسلام کے خلاف بد زبانیاں کی ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ بھی مسلمانوں ہی کی غلطی ہے کہ انھوں نے شر کا جواب شر سے دے کر شیطان کی فتنہ انگیزیوں میں اس کے ساتھ تعاون کیا۔ ان غلطیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں کے دلوں میں کدورت پیدا ہوئی اور انھوں نے اسلام پر اس حیثیت سے کبھی نہیں غور کیا کہ یہ ان کو انہی کی بھلائی ہوئی سچائیوں کو یاد دلانے اور انہی کے نبیوں اور رسولوں کے ورثہ کو ان کی طرف منتقل کرنے آیا ہے بلکہ اس کو ایک حریف اور رہزن کی طرح نفرت کی نگاہ سے دیکھا جو ان کے دین و دھرم کو چھین کر ان کے اوپر خود مسلط ہونا چاہتا ہے۔

۲۔ اسلام کو پیش کرنے میں دوسری علمی غلطی یہ کی گئی کہ اس کو بحیثیت ایک نظام زندگی کے نہیں پیش کیا گیا جو زندگی کے سارے انفرادی و اجتماعی اور مابعد الطبیعی مسائل کو ایک وحدت میں پروتا اور سب کو عقل و فطرت کے مطابق حل کرتا ہے۔ بلکہ سارا زور ہمارے مبلغوں اور مناظروں نے چند ایسے مسائل پر صرف کیا جو عیسائیوں یا ہندوؤں

کے ساتھ مذہبی تصادم سے پیدا ہو گئے تھے مثلاً روح اور مادہ کے حدوث و قدم کی بحث، تناسخ کا مسئلہ، الوہیتِ مسیح اور تثلیث کا جھگڑا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے مسائل سے ہر فرقہ کے تھوڑے سے پیشہ ور مناظروں کو دلچسپی ہوتی ہے جن کی اصلی کامیابی ان کے حل کرنے میں نہیں بلکہ ان کو زیادہ سے زیادہ الجھا دینے میں ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کرنا اپنی قوت و قابلیت کو ضائع کرنا اور اپنے وقت کو برباد کرنا ہے۔ لیکن ہمارے مبلغین نے زیادہ تر اسی طرح کے معرکوں میں زندگیاں بسر کر ڈالیں اور انھیں اس بات پر غور کرنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ یہ مسائل تو چند انسانوں کی دلچسپی کے ہیں اور وہ بھی ان کو حل کرنا نہیں چاہتے بلکہ الجھانا چاہتے ہیں۔ باقی ساری دنیا کے سامنے تو آج بالکل دوسرے ہی مسائل ہیں جن کے حل کرنے کے لیے دنیا بے چین بھی ہے اور جن کے حل ہونے ہی پر دنیا کی نجات کا انحصار ہے۔ اور جو مذہب بھی آگے بڑھ کر ان مسائل کا قابل قبول حل پیش کر دے گا وہی ساری دنیا کا مذہب بن سکتا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں، جو اپنے ایجاد کیے ہوئے طریقوں کو آزما کر تھک چکی ہو، زندگی کے تمدنی و اجتماعی مسائل کا کوئی حل نہ پا رہی ہو، اگر اسلام کو محض چند عقائد اور چند رسوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تو آج دنیا کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ لیکن ہمارے اندر سے جو حضرات تبلیغ اسلام کے مقصد سے اٹھے یا جنھوں نے اسلام پر کتابیں لکھیں شاید ان کے سامنے مذہب کا یہی تصور تھا جو صرف چند اذعانیات پر مشتمل ہے اور زندگی کے عملی مسائل سے جس کو کوئی اثباتی تعلق نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح مسیحیت کی لایعنی موشگافیوں سے دنیا کے ذہین طبقہ نے کوئی دلچسپی نہیں لی اسی طرح اسلام کے ان مسائل کی طرف بھی پڑھی لکھی دنیا نے کوئی توجہ نہیں کی، اور تبلیغ اسلام کی یہ ساری ہماہمی، رسمی مذہبیت کے تھوڑے سے پرستاروں کے اندر محدود رہ گئی، اور اضاعت وقت کے سوا اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوا۔

---

(۳) اس سلسلہ کی تیسری علمی غلطی یہ ہے کہ اسلام پر جو کچھ لکھا گیا وہ یا تو خالص اکیڈمک قسم کی چیزیں ہیں یا مناظرانہ طرز کی ہیں یا معذرت خواہانہ انداز کی ہیں یا پھر محض بحث و استدلال کے رنگ میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی نسبت بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ ان میں دعوت دین کے مقصد کیلئے کوئی چیز بھی اصلاً نافع نہیں ہے۔ علمی بحثیں ان لوگوں کے لیے بے شک مفید ہیں جو اسلام کے اس پہلو پر بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہوں جس سے وہ بحث متعلق ہے لیکن دعوت

و تبلیغ کے لیے نہ وہ لکھی جاتیں نہ اس مقصد کے لیے ان کے اندر کوئی صلاحیت اور کشش ہوتی۔ مناظرانہ طرز کی چیزیں اولاً تو جیسا کہ اوپر مذکور ہوا چند مخصوص قسم کے مسائل پر ہیں جن سے اسلام کا کوئی آئیڈیا نہیں ہوتا۔ ثانیاً ان کے اندر وہ تمام خرابیاں ہیں جو دلوں کو اسلام سے قریب کرنے کے بجائے دور کرتی ہیں۔ معذرت خواہانہ انداز کی چیزوں سے ہمارا اشارہ ان حضرات کی مذہبی تصنیفات کی طرف ہے جو یورپ سے مرعوب تھے۔ جو چیز اہل یورپ کے ہاں ممدوح قرار پاگئی، ان حضرات نے کوشش کی کہ اس کا وجود اسلام میں بھی ثابت کردیں اگرچہ اسلام اس سے ہزاروں کوس دور ہو۔ اسی طرح جو چیز ان کے ہاں مبغوض قرار دیدی گئی اس کے انکار کے دلائل ان حضرات نے بھی جمع کرنے شروع کردیے اگرچہ وہ اصول اسلام میں داخل ہو۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کمزور اور منفعل ذہنیت کے لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے نہ تو وہ اسلام کی صحیح ترجمانی ہے اور نہ اس کے اندر وہ داعیانہ اذعان و یقین ہے جو دلوں کو کھینچتا اور دماغوں کو اپیل کرتا ہے۔ متکلمانہ طرز پر جو چیزیں لکھی گئی ہیں وہ ان سب سے زیادہ مایوس کن ہیں۔ متکلمین کا طرز استدلال عقل و فطرت سے سب سے زیادہ دور ہے۔ اس سے کسی مسئلہ کی گرہوں میں اضافہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن کسی گرہ کو کھولا نہیں جا سکتا۔ یہ طرز استدلال صرف کج بحثیوں کے لیے موزوں ہے۔ اس کے اندر نہ تو دلنشینی ہے، نہ کشش ہے۔ نہ یہ عقل سلیم اور فطرت انسانی سے کوئی موافقت رکھتا۔ اور اسلام کو پیش کرنے کا ذریعہ اس کو بنانا لوگوں کو اسلام سے متنفر اور بدگمان کرنا ہے۔ اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا واحد طریقہ وہی تھا جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول نے اختیار کیا لیکن ہمارے متکلمین یونانیوں کے فلسفہ سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ انھوں نے قرآن کے طرز استدلال کی طرف نہ صرف یہ کہ سرے سے کوئی توجہ ہی نہیں کی بلکہ الٹا اس کو مطعون کیا اور حقیر ٹھیرایا۔ یہ غلطی ہمارے پرانے متکلمین نے بھی کی اور اسی غلطی کے مرتکب ہمارے نئے متکلمین ہوئے۔ ان غلطیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں پر اسلام کی حجت تمام کرنا تو الگ رہا خود پڑھے لکھے مسلمان بھی جو مسلمان باقی رہنا چاہتے تھے یا کم از کم اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا چاہتے تھے، یہ کہنے لگے کہ اسلام بس دل سے مان لینے کی چیز ہے۔ عقل سے سمجھنے کی چیز نہیں ہے۔ اور جو جری اور بیباک تھے وہ علانیہ اسلام کا مذاق اڑانے اور اس کی تعلیمات کا تمسخر کرنے لگے۔ اور نام کے سوا ہر چیز میں اسلام سے بالکل آزاد ہوگئے۔

مروجہ طریقہ تبلیغ میں عملی پہلو سے بھی کچھ کم غلطیاں نہیں ہیں۔ ان میں سے بھی بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرینگے۔

(۱) پہلی عملی غلطی مسلمانوں کی شترگربگی ہے۔ شترگربگی سے مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ ایک اصولی جماعت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جس کی تعمیر اسلام اور ایمان کے اصولوں پر ہوئی ہے لیکن دوسری طرف یہ اس طرح کی تمام خصوصیات بھی رکھتے ہیں جس طرح کی خصوصیات ایک قوم میں ہوتی ہیں جو نسل و نسب یا وطن کے اشتراک یا تہذیب و معاشرت کی یکسانی سے بن جاتی ہے۔ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان وہ ہے جو اللہ پر، اس کے رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، یوم آخرت پر ایمان لائے اور معیشت و معاشرت اور اخلاق و عمل کے سارے گوشوں میں اللہ اور اس کے رسولوں کے بتائے ہوئے طریقوں کا پابند ہو۔ دوسری طرف بے شمار ایسے انسان بھی ان کے اندر شامل ہیں جو بجز اس کے کہ کسی مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ہیں اور کسی طرح کا بھی اشتراک ان کے ساتھ نہیں رکھتے۔ نہ صرف یہ کہ وہ ان اصولوں پر عمل نہیں کرتے جن پر اسلامی جماعت کی تعمیر ہوئی ہے بلکہ ان کے کھلم کھلا منکر ہیں، تاہم نہ صرف یہ کہ وہ مسلمانوں کے اندر شامل ہیں بلکہ ان کی نمائندگی اور قیادت تک کرتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ اخلاق و عمل کا ایک پورا نظام پیش کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ان سے منحرف ہو کر کوئی شخص مسلمان نہیں باقی رہ سکتا دوسری طرف بد اخلاقی اور بد عملی کی جتنی قسمیں دوسری قوموں کے اندر پائی جاتی ہیں ان سب کے نمونے وہ خود پیش کرتے ہیں اور اس سے ان کی اسلامیت میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی۔ ایک طرف تو یہ اپنی ساری وابستگی ایک نظام حق کے ساتھ دکھاتے ہیں لیکن دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر مصطفیٰ کمال تک کی پوری تاریخ کو اسلامی تاریخ بتاتے ہیں جس کا ایک بڑا حصہ اسلام کے نظام حق سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ ایک طرف تو یہ مدعی ہیں کہ ہر باطل نظام سے ان کا تعلق نہ صرف منفی قسم کا ہے بلکہ اس کی مخالفت اور عداوت ان کے ایمان کا مقتضیٰ ہے لیکن دوسری طرف یہ حال ہے کہ انگریزوں کے قائم کیے ہوئے نظام باطل کے ہر شعبہ میں حصہ لینے کے لیے یہ اسی طرح بھاگ دوڑ کر رہے ہیں جس طرح اس ملک کی غیر مسلم قومیں کر رہی ہیں۔ اپنی یہ دورنگی چاہے مسلمان خود نہ محسوس کرتے ہوں لیکن دوسری قومیں کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کی اس عجیب و غریب پوزیشن پر قہقہہ نہ لگائیں۔ وہ ایک ہی جماعت کی طرف سے یہ دو متناقض دعوے سن کر حیران ہوتی ہیں اور ان میں سے اگر کسی خدا کے بندے کو اللہ کی توفیق سے اسلام کی طرف کشش بھی ہوتی ہے تو وہ یہ دیکھ کر رک جاتا ہے

کو مسلمان تو اسی طرح کی قوم ہے جس طرح کی قوم سے نکل کر وہ ان کی طرف جانا چاہتا ہے۔ پھر ایک قوم کو چھوڑ کر بالکل اسی طرح کی قوم میں داخل ہونے کے کیا معنی! ہماری اس دورنگی کے باوجود اگر کوئی نیک دل غیر مسلم اسلام لاتا ہے تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ ہماری دعوت کی وجہ سے اسلام نہیں لاتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اس کے دین کی غلطی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا غلط ہونا بھی واضح کر دیا ہے اور وہ اسلام کو مسلمانوں سے بالکل الگ کر کے دیکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے پاک نفوس دنیا میں بہت کم ہیں۔ ورنہ وہ قوم دنیا میں اسلام کی اشاعت کیا کر سکتی ہے جس کے بے اصولے پن کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک بزرگ تبلیغ دین یا اشاعت علم دین کے لیے ایک ادارہ قائم کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے مسلمانوں سے روپیہ وصول کر کے سود پر چلاتے ہیں۔ خود ایک ہندو یا عیسائی تبلیغی کالج میں نوکر ہیں اور اپنے صاحبزادوں کو کسی آریہ یا مشن کالج میں تعلیم دلا رہے ہیں!

---

(۲) دوسری عملی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے بھی شاید مسیحی مشنریوں کی دیکھا دیکھی ہمیشہ تبلیغ کے لیے پست حال طبقوں ہی پر نظر رکھی حالانکہ یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ تبلیغ میں اول خطاب ان طبقات کی طرف ہونا چاہیے جن کے افکار ونظریات کی قیادت میں سوسائٹی کا نظام چلتا ہے۔ یہی لوگ دراصل کسی قوم کو بناتے ہیں یا بگاڑتے ہیں۔ اگر یہ راہ راست پر آجائیں تو سارا نظام آپ سے آپ راہ راست پر آجاتا ہے اور اگر یہ بگڑے ہوئے رہیں تو اولاً تو نیچے کے طبقات میں کوئی اصلاح واقع نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو وہ بالکل عارضی ہوتی ہے۔ ان کا منفعل مزاج بہت جلد ان خرابیوں کو پھر قبول کر لیتا ہے جن کا دباؤ اوپر کے موثر اور حاکم طبقہ کی طرف سے پڑتا ہے۔ اس کی مثال بالکل قلب اور اعضا و جوارح کی ہے۔ اگر قلب کی اصلاح ہو جائے تو سارا جسم خود بخود تندرست ہو جاتا ہے اور اگر دل میں بیماری ہو تو اعضا و جوارح پر روغن کی مالش اور ضماد سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ عیسائی مشنریوں کے سامنے صرف اپنی تعداد بڑھانے کا سوال تھا اس وجہ سے ان کے لیے یہ تدبیر کارگر تھی لیکن مسلمانوں کے لیے صرف اضافہ تعداد کے خیال سے تبلیغ کرنا ناجائز ہے۔ ان کو تو اللہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لانا اور ان کی پوری زندگی کو سنوارنا ہے اس طرح کا سنوارنا اسی وقت ممکن ہے جب پورا ماحول سنورے اور پورے ماحول کا سنورنا صرف اس صورت میں متوقع ہے جب سوسائٹی کا ذہن اور کارفرما طبقہ اصلاح قبول کرے۔ جو لوگ اجتماعیات پر تھوڑی بہت نظر رکھتے ہیں

وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ ہنگامی اور انقلابی تحریکیں تو نیچے سے چل کر اوپر کے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہیں لیکن ٹھوس اصلاحی اور عقلی دعوتیں اسی وقت جڑ پکڑتی ہیں جب اوپر سے نیچے کی طرف اثر انداز ہوں۔ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے دعوت دین کا کوئی کام کیا، خواہ مسلمانوں کے اندر یا ان سے باہر، انھوں نے بالعموم یہ غلطی کی کہ اپنی نظر ہمیشہ پست حال طبقوں کی طرف رکھی اور ان کو کلمہ پڑھا کر یا نماز سکھا کر انھوں نے سمجھا کہ ان کی اصلاح ہو گئی۔ بے شبہہ اس طرح سے بعض جزئی اصلاحیں تو ہو جاتی ہیں لیکن زندگی بحیثیت مجموعی نہ کوئی تبدیلی قبول کرتی نہ قبول کرسکتی ہے۔ جب آب و ہوا بحیثیت مجموعی خراب ہو تو مریضوں کے علاج سے زیادہ اسباب مرض کے استیصال کی کوشش کرنی چاہیے اور ان گندے نالوں کو بھرنا چاہیے جو جراثیم کو پھیلاتے اور ہوا کو خراب کرتے ہیں۔ اس کے بغیر جو اصلاح بھی ہوتی ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ رہے تو ایک شخص ایسے مقام پر جہاں طاعون اور ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی ہے لیکن اس کو ٹیکہ لگا دیا جائے۔ یہ ٹیکہ عارضی طور پر ممکن ہے مفسد اثرات کا کچھ دنوں تک مقابلہ کرے لیکن تابکے! یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام نے، جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے معلوم ہوگا، کبھی عام لوگوں کو پہلے خطاب نہیں فرمایا بلکہ سوسائٹی کے کارفرما عناصر کی ذہنیتوں کو تبدیل کرنے کی کوشش فرمائی۔ اور ان کی اصلاح کو عوام کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔

---

(۳) تیسری عملی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے تبلیغ کا ذریعہ صرف الفاظ کو بنایا۔ حقیقی اسلامی زندگی کا عملی مظاہرہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ مجرد اسلام کے اصولوں کی خوبی کی وجہ سے تو صرف تھوڑے سے ذہین اور غیر معمولی اخلاقی جرأت رکھنے والے لوگ ایمان لاسکتے ہیں، دنیا کا بڑا حصہ تو اسی وقت ان اصولوں کی سچائی کا اقرار کرے گا جب عملی زندگی کے اندر ان کو ابھرتا اور اچھے نتائج پیدا کرتا ہوا دیکھے گا۔ لیکن ہمارے یہاں عرصے سے تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں جو جدوجہد کی گئی ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ہمارے خوش بیان واعظوں، پرجوش مبلغوں، اور انشا پرداز مصنفوں نے دنیا کو اسلامی زندگی کی خیالی فردوس کی سیر کرائی۔ اور لطف یہ کہ ایک طرف یہ حضرات اسلام کے تمدنی و اجتماعی برکات کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے رہے اور دوسری طرف پوری اسلامی سوسائٹی اپنے اندر تمام مفاسد جاہلیت کو لیے ہوئے، ان کے دعاوی کی تکذیب کرتی رہی۔ اور چونکہ عمل کی خاموش زبان دعوے کی ناطق زبان سے زیادہ موثر ہے اس وجہ سے یہ سارے وعظ فضا میں گم ہو گئے اور دنیا ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اگر مجرد لفاظی کو چھوڑ کر خدا کے کچھ بندوں نے اس بات کی کوشش کی ہوتی کہ جن اصولوں پر وہ ایمان لائے ہیں انہی
اصولوں پر ایک سوسائٹی کی تعمیر کریں تو اس کوشش میں ناکام ہو کر بھی وہ دعوت اسلام کی اس سے بدرجہا شاندار
خدمت انجام دے سکتے تھے جو انھوں نے اپنے وعظوں اور لکچروں میں کامیاب ہو کر انجام دی۔ اسلام کو فرد
اور جماعت اور ساری دنیا کے لیے خیر و برکت ثابت کرنے کے لیے نہ تنہا یہ چیز کافی ہو سکتی کہ عہد ماضی کے کچھ واقعات
لوگوں کو سنا دیے جائیں اور نہ یہی بات کچھ مفید ہے کہ اس کے عقلی امکانات پر مضامین لکھے جائیں اور تقریریں کی جائیں
اس کا واحد طریقہ صرف یہ تھا کہ اسلام کے اصولوں پر ایمان لانے والی جماعت اجتماعی صورت میں ان اصولوں
کا مظاہرہ کرتی۔ افسوس ہے کہ سب کچھ ہوا مگر یہی بات نہیں ہوئی۔

---

(۴) چوتھی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے بھی تبلیغ دین کیلئے بعض اسی طرح کے اوچھے طریقے اختیار کیے
جس طرح کے اوچھے طریقے عیسائی مشنری یا آریے استعمال کر رہے ہیں۔ عیسائیوں نے دنیا کے گرے
ہوئے طبقات کو جن ترغیبات یا ترہیبات سے عیسائی بنایا انہی طریقوں کو مسلمانوں نے اپنانا چاہا۔
جو ہتھکنڈے آریے استعمال کرتے تھے، مسلمان بھی بے تکلف ان کے استعمال کرنے پر اتر آئے۔ مناظروں
میں جو زبان درازیاں، رکیک پھبتیاں اور دھینگا مشتیاں دوسروں نے کیں، مسلمان بھی ان میں کسی سے
پیچھے نہیں رہے۔ مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر کسی لالچ میں آکر یا کسی غلط فہمی میں پڑ کر آریہ ہو گیا تو
آریوں نے اپنی فتح کا ڈنکا بجایا۔ اسی طرح اگر کسی ہندو نے اسلام کا اظہار کر دیا تو مسلمانوں نے اس کو
آسمان پر چڑھانے کی کوشش کی۔ نادان بچوں کو بہکانا اور بھگا لیجانا جس طرح دوسروں کے یہاں اشاعت
دین کے پروگرام کا ایک جز تھا اسی طرح مسلمان بھی ان چیزوں کو جائز سمجھنے لگ گئے۔ اگر نفس کے ہیجان
سے کوئی ہندو عورت کسی بے قید مسلمان کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوئی تو ساری قوم نے
اس کو اپنا مسئلہ بنا لیا اور اس طرح کی بے حیائی اور آوارگی بھی نصرت دین میں داخل ہو گئی۔ ان باتوں
کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی بد اخلاق عورتوں اور آوارہ منش مردوں نے تبدیل دین کو ایک پیشہ بنا لیا۔
صبح کو وہ اسلام کا اعلان کر کے مسلمانوں کے کندھوں پر سوار ہوتے اور شام کو اپنے آریہ یا عیسائی

ہونے کا اعلان کرکے آریوں یا عیسائیوں سے روپے اینٹھتے۔ جس زمانہ میں شدھی سنگٹھن کا زور تھا ایک بزرگ نے دلی کی "مسلمان رنڈیوں" تک کو بھی اپیل کی تھی کہ وہ اپنے غیر مسلم آشناؤں پر تبلیغ اسلام کیا کریں۔ ان حرکتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں کی نظروں میں اسلام بالکل بے وقعت ہوگیا۔ وہ یہ سمجھنے لگ گئے کہ یہ بھی دنیا کا ایک کاروبار اور تعداد بڑھانے کا ایک ذریعہ ہے جس کو محض عوام فریبی کے لیے مسلمان اللہ کے دین کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اور یہ سمجھنے میں وہ بالکل حق بجانب تھے کیونکہ جس مقصد سے اور جن طریقوں سے وہ یہ کام کر رہے تھے جب اسی مقصد اور انہی طریقوں سے، بالکل طابق النعل بالنعل، مسلمانوں نے بھی یہ کام انجام دیا تو آخر ان کے دلوں پر اسلام کی برتری کا سکہ کیسے جمتا!

---

(۵) پانچویں عملی غلطی یہ ہے کہ اس زمانہ میں چاہے کسی اور کام کے لیے مسلمان کسی قابلیت کی ضرورت سمجھتے ہوں مگر دو کاموں کے لیے سرے سے کسی قابلیت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ایک امامت مسجد، دوسرے تبلیغ دین۔ ایک زمانہ تو وہ تھا جب مسجد میں امامت یا تو امیر اسلام کرتا تھا یا وہ شخص جس کو امیر اسلام اس کام پر مقرر کرے۔ یا اب یہ زمانہ ہے کہ جو شخص دنیا کا کوئی اور کام انجام دینے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو مسلمان اس کو اپنی مسجدوں کی امامت کے لیے ڈھونڈتے ہیں۔ اسی طرح ایک زمانہ تو وہ تھا جب ہر مسلمان یہ سمجھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو برپا ہی اس لیے کیا ہے کہ خدا کے رسول نے دین حق جس احساس ذمہ داری، جس سرگرمی اور جس دلسوزی کے ساتھ ان کو پہنچایا ہے اسی احساس ذمہ داری اور سرگرمی اور دلسوزی کے ساتھ یہ دوسروں کو پہنچائیں اور اسلام کا سیاسی ادارہ، اپنے تمام شعبوں اور اپنے تمام عمّال سے اعلیٰ کارکنوں سمیت، صرف اس فریضۂ رسالت کی ادائگی کا ایک ذریعہ تھا جو اللہ کے رسول کی طرف سے اس امت کی طرف منتقل ہوا تھا۔ یا اب یہ حال ہے کہ پوری اسلامی سوسائٹی تو اپنے تمام ذہین اور کارفرما افراد و طبقات کے ساتھ ایک نظام باطل کی خدمت میں لگی ہوئی ہے البتہ خدا کے بعض نیک بندوں کو کبھی کبھی یہ خیال بھی ہو جایا کرتا ہے کہ تبلیغ اسلام بھی ایک نیک کام ہے اور اگر وہ سرمایہ دار ہیں تو اپنا کچھ سرمایہ الگ کرکے اور اگر سرمایہ دار نہیں ہیں تو مسلمانوں سے چندے اکٹھا کرکے کچھ تنخواہ دار ملازمین تبلیغ اسلام کے لیے مقرر کر دیتے ہیں۔ ان ملازمین میں سب سے بڑی صفت جو تلاش کی جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے متعلق کچھ الٹی سیدھی معلومات رکھتے ہوں اور مناظرہ اور تقریر کر سکتے ہوں

انہی جگہوں کو پر کرنے کے لیے ہمارے بہت سے عربی مدرسوں میں مناظرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس چیز کی طرف وہی طلبہ رغبت کرتے ہیں جو ذہنی اعتبار سے بالعموم ناقص ہوتے ہیں اور ٹھوس علمی چیزوں سے گھبراتے ہیں۔ یہی لوگ کچھ تقریر اور مناظرہ کی مشق بہم پہنچا کر اور کچھ ادھر اُدھر سے اسلام اور دوسرے مذاہب کے متعلق بے ربط معلومات فراہم کر کے کسی انجمن کی طرف سے تبلیغ اسلام شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ اسلام سے واقف ہوتے، نہ دوسرے مذاہب سے، اور نہ ان کے اندر اسلامی سیرت ہوتی۔ محض زبان کے زور سے یہ لوگ اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ معلوم ہے۔

مروجہ طریقہ تبلیغ کی بعض موٹی موٹی علمی و عملی غلطیوں کی طرف ہم نے یہ اشارہ محض اس لیے کیا ہے کہ ہمارے رفقا کو جو تبلیغ کرنی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو اب تک ہندوستان میں ہوتی رہی ہے۔ ہمارے سامنے بعینہ وہی دعوت ہے جو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے دی اور اس دعوت کو پھیلانے کا طریقہ بھی وہی ہے جو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے اختیار فرمایا۔ ہم جس طرح ان کی دعوت میں کسی قسم کی تبدیلی ناجائز سمجھتے ہیں اسی طرح اس دعوت کے طریق کار میں بھی ہمارے نزدیک کسی قسم کی ترمیم ناجائز ہے۔ یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا ہے اس وجہ سے وہ تمام خوبیاں اور برکتیں اس کے اندر موجود ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ میں ہوتی ہیں۔ دنیا میں اس طریقہ کا بارہا تجربہ ہو چکا ہے اور ہمیشہ یہ کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ اگر یہ طریقہ ہم نے بھی اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ اس مقصد کو ہمارے ہاتھوں بلند کرے گا جس کے لیے ہم عزم کر کے اٹھے ہیں۔ اس میں مشکلیں ہیں لیکن جب آدمی یہ خیال کر کے اس طریقہ کو اختیار کرتا ہے کہ اسی کو صرف انبیا و صلحا نے اختیار کیا ہے اور کسی نے اس کو اختیار کرنے کی توفیق نہیں پائی تو اس کی ساری مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ یہ صبر آزما، خشک اور بے مزہ ضرور ہے لیکن جب آدمی یہ سوچ کر اس کو پسند کرتا ہے کہ اس کو اختیار کرنے والے کبھی نامراد نہیں ہوئے تو اس کی ساری خشکی اور بدمزگی حلاوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آئندہ ہم قرآن کی روشنی میں پوری تفصیل کے ساتھ بتائیں گے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے کس مقصد کی تبلیغ کی، کس طرح تبلیغ کی، ان کی تبلیغ میں کیا کیا مرحلے پیش آئے اور ہر مرحلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی رہنمائی کے لیے کیا ہدایتیں نازل ہوئیں اور اس طریقہ تبلیغ سے کیا برکتیں ظہور میں آئیں۔

تفہیم القرآن

(۳۲)

التوبہ

(از وسط رکوع ۱۴ تا ختم سورہ)

اللہ نے معاف کر دیا نبی کو اور اُن مہاجرین و انصار کو جنھوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا۔[117] اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے[118] (مگر جب انھوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبی کا ساتھ ہی دیا تو) اللہ نے انھیں معاف کر دیا[119]۔ بے شک اُس کا معاملہ ان کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے۔ اور اُن تینوں کو بھی اس نے معاف کیا جو پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے۔ جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انھوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامنِ رحمت کے سوا نہیں ہے، تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں، یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے[120]۔

[117] یعنی غزوہ تبوک کے سلسلہ میں جو چھوٹی چھوٹی لغزشیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے ہوئیں ان سب کو اللہ نے ان کی اعلیٰ خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے معاف فرما دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو لغزش ہوئی تھی اس کا ذکر ساتویں رکوع کے آغاز میں گذر چکا ہے یعنی یہ کہ جن لوگوں نے استطاعت رکھنے کے باوجود جنگ سے پیچھے رہ جانے کی اجازت مانگی تھی ان کو آپ نے اجازت دیدی تھی۔

[118] یعنی بعض مخلص صحابی بھی اس سخت وقت میں جنگ پر جانے سے کسی نہ کسی حد تک جی چرانے لگے تھے، مگر چونکہ ان کے دلوں میں ایمان تھا اور وہ سچے دل سے دینِ حق کے ساتھ محبت رکھتے تھے اس لیے آخرکار وہ اپنی اس کمزوری پر غالب آگئے۔

[119] یعنی اب اللہ اس بات پر ان سے مواخذہ نہ کرے گا کہ ان کے دلوں میں کجی کی طرف یہ میلان کیوں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے کہ اللہ اس کمزوری پر گرفت نہیں کرتا جس کی انسان نے خود اصلاح کر لی ہو۔

[120] یہ تین صاحب کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع تھے۔ تینوں سچے مومن تھے۔ (باقی بر صفحہ ۱۰)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) اس سے پہلے اپنے اخلاص کا بارہا ثبوت دے چکے تھے، قربانیاں کر چکے تھے۔ آخر الذکر دو اصحاب تو غزوۂ بدر کے شرکاء میں سے تھے جن کی صداقت ایمانی ہر شبہہ سے بالاتر تھی، اور اول الذکر بزرگ اگرچہ بدری نہ تھے لیکن بدر کے سوا ہر غزوہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ ان خدمات کے باوجود جو سستی اس نازک موقع پر، جبکہ تمام قابل جنگ اہل ایمان کو جنگ کے لیے نکل آنے کا حکم دیا گیا تھا، ان حضرات نے دکھائی اُس پر سخت گرفت کی گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک سے واپس تشریف لا کر مسلمانوں کو حکم دیدیا کہ کوئی ان سے سلام کلام نہ کرے۔ ۴۰ دن کے بعد ان کی بیویوں کو بھی ان سے الگ رہنے کی تاکید کر دی گئی، اور فی الواقع مدینہ کی بستی میں ان کا وہی حال ہو گیا جس کی آیت میں تصویر کھینچی گئی ہے۔ آخر کار جب ان کے مقاطعہ کو ۵۰ دن ہو گئے تب معافی کا حکم نازل ہوا۔

ان تینوں صاحبوں میں سے حضرت کعب بن مالک نے اپنا قصہ بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو غایت درجہ سبق آموز ہے۔ اپنے بڑھاپے کے زمانہ میں، جبکہ وہ نابینا ہو چکے تھے، انھوں نے اپنے صاحبزادے عبداللہ سے، جو ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں چلایا کرتے تھے، یہ قصہ خود بیان کیا:

"غزوۂ تبوک کی تیاری کے زمانہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی مسلمانوں سے شرکت جنگ کی اپیل کرتے تھے، میں اپنے دل میں ارادہ کر لیتا تھا کہ چلنے کی تیاری کروں گا مگر پھر واپس آ کر سستی کر جاتا تھا اور کہتا تھا کہ ابھی کیا ہے، جب چلنے کا وقت آئے گا تو تیار ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ اسی طرح بات ٹلتی رہی یہاں تک کہ لشکر کی روانگی کا وقت آ گیا اور میں تیار نہ تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ لشکر کو چلنے دو، میں ایک دو روز بعد راستہ ہی میں اس سے جا ملوں گا۔ مگر پھر وہی سستی مانع ہوئی حتیٰ کہ وقت نکل گیا۔

اس زمانہ میں جبکہ میں مدینہ میں رہا میرا دل یہ دیکھ دیکھ کر بے حد کڑھتا تھا کہ میں پیچھے جن لوگوں کے ساتھ رہ گیا ہوں وہ یا تو منافق ہیں یا وہ ضعیف اور مجبور لوگ جن کو اللہ نے معذور رکھا ہے۔

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو حسب معمول آپ نے پہلے مسجد میں آ کر دو رکعت نماز پڑھی پھر لوگوں سے ملاقات کے لیے بیٹھے۔ اس مجلس میں منافقین نے آ کر اپنے عذرات لمبی چوڑی قسموں کے ساتھ پیش کرنے شروع کیے۔ یہ ۸۰ سے زیادہ آدمی تھے۔ حضورؐ نے اُن میں سے ایک ایک کی بناوٹی باتیں سنیں، ان کے ظاہری عذرات کو قبول کر لیا، اور ان کے باطن کو خدا پہ چھوڑ کر فرمایا خدا تمھیں معاف کرے۔ پھر میری باری آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ آپ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا "تشریف لائیے! آپ کو کس چیز نے روکا تھا؟" میں نے عرض کیا، "خدا کی قسم اگر میں اہل دنیا میں سے کسی کے سامنے حاضر ہوا ہوتا تو ضرور کوئی نہ کوئی بات بنا کر اس کو راضی کرنے کی کوشش کرتا، باتیں بنانی تو مجھے بھی آتی ہیں، مگر آپ کے

متعلق میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر اس وقت کوئی جھوٹا عذر پیش کر کے میں نے آپ کو راضی کر بھی لیا تو اللہ ضرور آپ کو مجھ سے پھر ناراض کر دے گا، البتہ اگر سچ کہوں تو چاہے آپ ناراض ہی کیوں نہ ہوں، مجھے امید ہے کہ اللہ میرے لیے معافی کی کوئی صورت پیدا فرما دے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس کوئی عذر نہیں ہے جسے پیش کر سکوں، میں جانے پر پوری طرح قادر تھا۔" اس پر حضور نے فرمایا "یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی۔ اچھا، اٹھ جاؤ اور انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تمہارے معاملہ میں کوئی فیصلہ کرے۔" میں اٹھا اور اپنے قبیلے کے لوگوں میں جا بیٹھا۔ یہاں سب کے سب میرے پیچھے پڑ گئے اور مجھے بہت ملامت کی کہ تو نے کوئی عذر کیوں نہ کر دیا۔ یہ باتیں سن کر میرا نفس بھی کچھ آمادہ ہونے لگا کہ پھر حاضر ہو کر کوئی بات بنا دوں۔ مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ دو اور صالح آدمیوں (مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ) نے بھی وہی سچی بات کہی ہے جو میں نے کہی تھی، تو مجھے تسکین ہو گئی اور میں اپنی سچائی پر جما رہا۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عام حکم دیدیا کہ ہم تینوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کرے۔ وہ دونوں تو گھر بیٹھ گئے، مگر میں نکلتا تھا، جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا تھا، بازاروں میں چلتا پھرتا تھا اور کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سرزمین بالکل بدل گئی ہے، میں یہاں اجنبی ہوں اور اس بستی میں کوئی بھی میرا واقف کار نہیں۔ مسجد میں نماز کے لیے جاتا تو حسب معمول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتا تھا، مگر بس انتظار ہی کرتا رہ جاتا تھا کہ جواب کے لیے آپ کے ہونٹ جنبش کریں۔ نماز میں نظریں چرا کر حضور کو دیکھتا تھا کہ آپ کی نگاہیں مجھ پر کیسی پڑتی ہیں۔ مگر وہاں حال یہ تھا کہ جب تک میں نماز پڑھتا آپ میری طرف دیکھتے رہتے، اور جہاں میں نے سلام پھیرا کہ آپ نے میری طرف سے نظر ہٹائی۔ ایک روز میں گھبرا کر اپنے چچازاد بھائی اور بچپن کے یار ابوقتادہ کے پاس گیا اور ان کے باغ کی دیوار پر چڑھ کر انھیں سلام کیا مگر اس اللہ کے بندے نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے کہا "ابوقتادہ، میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا میں خدا اور اس کے رسول سے محبت نہیں رکھتا؟" وہ خاموش رہے۔ میں نے پھر پوچھا۔ وہ پھر خاموش رہے۔ تیسری مرتبہ جب میں نے قسم دے کر یہی سوال کیا تو انھوں نے بس اتنا کہا کہ "اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے"۔ اس پر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اور میں دیوار سے اتر آیا۔ انہی دنوں ایک دفعہ میں بازار سے گذر رہا تھا کہ شام کے نبطیوں میں سے ایک شخص مجھے ملا اور اس نے شاہ غسان کا خط حریر میں لپٹا ہوا مجھے دیا۔ میں نے کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ "ہم نے سنا ہے تمہارے صاحب نے تم پر ستم توڑ رکھا ہے، تم کوئی ذلیل آدمی نہیں ہو، نہ اس لائق ہو کہ تمہیں ضائع کیا جائے، ہمارے پاس آجاؤ، ہم تمہاری قدر کریں گے۔" میں نے کہا یہ ایک اور بلا نازل ہوئی، اور اسی وقت اس خط کو چولھے میں جھونک دیا۔

چالیس دن اس حالت پر گذر چکے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آدمی حکم لے کر آیا کہ اپنی بیوی سے بھی علیحدہ ہو جاؤ۔ میں نے

پوچھا کیا طلاق دیدوں؟ جواب ملا نہیں، بس الگ رہو۔ چنانچہ میں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تم اپنے میکے چلی جاؤ، اور انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔

پچاسویں دن صبح کی نماز کے بعد میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا اور اپنی جان سے بیزار ہو رہا تھا کہ یکایک کسی شخص نے پکار کر کہا مبارک ہو کعب بن مالک! میں یہ سنتے ہی سجدے میں گر گیا اور میں نے جان لیا کہ میری معافی کا حکم ہو گیا ہے۔ پھر تو فوج در فوج لوگ بھاگے چلے آ رہے تھے اور ہر ایک دوسرے سے پہلے پہنچ کر مجھ کو مبارک باد دے رہا تھا کہ تیری توبہ قبول ہو گئی۔ میں اٹھا اور سیدھا مسجد نبوی کی طرف چلا۔ دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ خوشی سے چمک رہا ہے۔ میں نے سلام کیا تو فرمایا "تجھے مبارک ہو، یہ دن تیری زندگی میں سب سے بہتر ہے۔" میں نے پوچھا یہ معافی حضور کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے؟ فرمایا خدا کی طرف سے، اور یہ آیات سنائیں۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ میں اپنا سارا مال خدا کی راہ میں صدقہ کر دوں۔ فرمایا کچھ رہنے دو کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ میں نے اس ارشاد کے مطابق اپنا خیبر کا حصہ رکھ لیا، باقی سب صدقہ کر دیا۔ پھر میں نے خدا سے عہد کیا کہ جس راست گفتاری کے صلے میں اللہ نے مجھے معافی دی ہے اس پر تمام عمر قائم رہوں گا، چنانچہ آج تک میں نے کوئی بات جان بوجھ کر خلاف واقعہ نہیں کہی اور خدا سے امید رکھتا ہوں کہ آئندہ بھی مجھے اس سے بچائے گا۔"

یہ قصہ اپنے اندر بہت سے سبق رکھتا ہے جو ہر مومن کے دلنشین ہونے چاہئیں۔

سب سے پہلی بات تو اس سے یہ معلوم ہوئی کہ کفر و اسلام کی کشمکش کا معاملہ کس قدر اہم اور کتنا نازک ہے کہ اس کشمکش میں کفر کا ساتھ دینا تو در کنار، جو شخص اسلام کا ساتھ دینے میں، بدنیتی سے بھی نہیں نیک نیتی سے، تمام عمر بھی نہیں کسی ایک موقع ہی پر کوتاہی برت جاتا ہے اس کی بھی زندگی بھر کی عبادت گزاریاں اور دینداریاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں، حتیٰ کہ ایسے عالی قدر لوگ بھی گرفت سے نہیں بچتے جو بدر و احد اور احزاب و حنین کے سخت معرکوں میں جانبازی کے جوہر دکھا چکے تھے اور جن کا اخلاص و ایمان ذرہ برابر بھی مشتبہ نہ تھا۔

دوسری بات جو اس سے کچھ کم اہم نہیں، یہ ہے کہ ادائے فرض میں تساہل کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ بسا اوقات محض تساہل ہی تساہل میں آدمی کسی ایسے قصور کا مرتکب ہو جاتا ہے جس کا شمار بڑے گناہوں میں ہوتا ہے، اور اس وقت یہ بات اسے پکڑ سے نہیں بچا سکتی کہ اس نے اس قصور کا ارتکاب بدنیتی سے نہیں کیا تھا۔

پھر یہ قصہ اس سوسائٹی کی روح کو بڑی خوبی کے ساتھ ہمارے سامنے بے نقاب کرتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں بنی تھی۔ ایک طرف منافقین ہیں جن کی غداریاں سب پر آشکارا ہیں، مگر ان کے ظاہری عذر سن لیے جاتے ہیں اور درگذر کیا جاتا ہے، کیونکہ ان سے خلوص کی امید ہی کب تھی کہ اب اس کے عدم کی شکایت کی جاتی۔ دوسری طرف ایک آزمودہ کار مومن ہے جس کی جاں نثاری پر شبہ تک کی گنجائش نہیں، اور وہ جھوٹی باتیں بھی نہیں بناتا، صاف صاف قصور کا اعتراف کر لیتا ہے، مگر اس پر غضب کی بارش برسادی جاتی ہے، نہ اس بنا پر کہ اس کے مومن ہونے میں کوئی شبہ ہو گیا ہے بلکہ اس بنا پر کہ مومن ہو کر اس نے وہ کام کیوں کیا جو منافقوں کے کرنے کا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ زمین کے نمک تو تم ہو، تم سے بھی اگر نمکینی حاصل نہ ہوئی تو پھر اور نمک کہاں سے آئے گا۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس سارے قضیہ میں لیڈر جس شان سے سزا دیتا ہے اور پیرو جس شان سے اس سزا کو بھگتتا ہے، اور پوری جماعت جس شان سے اس سزا کو نافذ کرتی ہے، اس کا ہر پہلو بے نظیر ہے، اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس کی زیادہ تعریف کی جائے۔ لیڈر نہایت سخت سزا دے رہا ہے، مگر غصہ اور نفرت کے ساتھ نہیں، گہری محبت کے ساتھ دے رہا ہے، باپ کی طرح شفقت بار نگاہوں کا ایک گوشہ ہر وقت یہ خبر دیے جاتا ہے کہ تجھ سے دشمنی نہیں ہے بلکہ تیرے قصور پر تیری ہی خاطر دل دکھا ہے، تو درست ہو جائے تو یہ سینہ تجھے چمٹا لینے کے لیے بے چین ہے۔ پیرو سزا کی سختی پر تڑپ رہا ہے مگر صرف یہی نہیں کہ اس کا قدم جادۂ اطاعت سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ڈگمگاتا، اور صرف یہی نہیں کہ اس پر غرور نفس اور حمیت جاہلیہ کا کوئی دورہ نہیں پڑتا، اور علانیہ استکبار پر اتر آنا تو درکنار وہ دل میں اپنے محبوب لیڈر کے خلاف کوئی شکایت تک نہیں آنے دیتا، بلکہ اس کے برعکس وہ لیڈر کی محبت میں اور زیادہ سرشار ہو گیا ہے، سزا کے ان پورے پچاس دنوں میں اس کی نظریں سب سے زیادہ بے تابی کے ساتھ جس چیز کی تلاش میں رہیں وہ یہی تھی کہ سردار کی آنکھوں میں وہ نوازش و التفات اس کے لیے باقی ہے یا نہیں جو اس کی امیدوں کا آخری سہارا ہے۔ گویا وہ ایک قحط زدہ کسان تھا جس کا سارا سرمایۂ امید بس ایک ذرا سا ٹکڑا ابر تھا جو آسمان کے کنارے پر نظر آتا تھا۔ پھر جماعت کو دیکھیے تو اس کے ڈسپلن اور اس کی صالح اخلاقی اسپرٹ پر انسان عش عش کر جاتا ہے۔ ڈسپلن کا یہ حال کہ ادھر لیڈر کی زبان سے بائیکاٹ کا حکم نکلا، ادھر پوری جماعت نے مجرم سے نگاہیں پھیر لیں، جلوت تو درکنار خلوت تک میں کوئی قریب سے قریب رشتہ دار اور کوئی گہرے سے گہرا دوست بھی اس سے بات نہیں کرتا۔ بیوی تک اس سے الگ ہو جاتی ہے، خدا کا واسطہ دے دے کر پوچھتا ہے کہ میرے خلوص میں تو تم کو شبہ نہیں ہے، مگر وہ لوگ بھی جو مدت العمر سے اس کو مخلص جانتے تھے صرف کہہ دیتے ہیں کہ ہم سے نہیں، خدا اور اس کے رسول سے اپنے خلوص کی سند حاصل کرو۔

دوسری طرف اصلاح و تربیت اتنی بلند و پاکیزہ کہ ایک شخص کی چڑھی ہوئی کمان اترتے ہی ہوا خواہوں کا کوئی گروہ اس کا گوشت نوچنے اور اس سے مزا لینے کے لیے نہیں لپکتا بلکہ اس پر سے تازیانۂ عتاب جیسے ہی ہٹا ہے تو یکایک ایک فرد اپنے اس معتوب بھائی کی مصیبت پر رنجیدہ ہوتا ہے، اس کو بچانے اٹھ کر لطیفے کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ اور معافی کا اعلان ہوتے ہی ہر ایک دوڑ پڑتا ہے کہ سب سے پہلے پہنچ کر اس سے ملیں اور اسے خوشخبری پہنچائیں۔ یہ نمونہ ہے اُس صالح جماعت کا جسے قرآن دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس پس منظر میں جب ہم آیت زیر بحث کو دیکھتے ہیں تو ہم پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان صاحبوں کو اللہ کے ہاں سے جو معافی دی گئی ہے اور اس معافی کے انداز بیان میں جو رحمت و شفقت ٹپکی پڑتی ہے اس کی وجہ ان کا یہ اخلاص ہے جس کا ثبوت انھوں نے پچاس دن کی سخت سزا کے دوران میں دیا تھا۔ اگر تصور کرتے وہ اکڑتے اور اپنے لیڈر کی ناراضی کا جواب غصے اور عداوت، بغاوت اور سرکشی سے دیتے، اس طرح جس طرح کسی خود پرست انسان کا غرورِ نفس زخم کھا کر بھڑکا کرتا ہے، اور مقاطعہ کے دوران میں ان کی آزمائش سے ثابت ہوتا کہ ہمیں جماعت سے کٹ جانا گوارا ہے مگر اپنی خودی کے بت پر چوٹ کھانا گوارا نہیں ہے، اور اگر وہ سزا کے پورے زمانے میں دوڑ دھوپ میں لگے رہتے کہ جماعت کے اندر بددلی پھیلائیں اور بددل لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنا ہم نوا بنائیں، تاکہ ایک ٹولہ جتھا بنا لیں، تو معافی کیسی، انھیں تو یقیناً جماعت سے کاٹ پھینکا جاتا اور اس سزا کے بعد ان کو ایسی سزا دی جاتی کہ جب تک اپنی خودی کے بت ہی کو پوجتے رہو، اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد میں حصہ لینے کی سعادت اب تمھیں نصیب نہیں ہوسکے گی۔ لیکن ان تینوں صاحبوں نے اس کڑی آزمائش کے موقع پر یہ راستہ اختیار نہیں کیا جو ان کے لیے کھلا ہوا تھا۔ اس کے برعکس انھوں نے وہ روش اختیار کی جو ابھی آپ دیکھ آئے ہیں، اور اس روش کو اختیار کر کے انھوں نے ثابت کر دیا کہ ان کے سینے میں کوئی بت باقی نہیں چھوڑا ہے جسے وہ پوجیں، وہ اپنی پوری شخصیت کو اللہ کی راہ کی جدوجہد میں جھونک چکے ہیں اور وہ اپنی ساری کشتیاں اس طرح جلا کر اسلامی جماعت میں آئے ہیں کہ اب یہاں سے پلٹ کر کہیں اور نہیں جا سکتے، یہاں کی ٹھوکریں کھا کر یہیں مر جائیں گے مگر کسی دوسری جگہ بڑی سے بڑی عزت بھی ملتی ہو تو یہاں کی ذلت چھوڑ کر اسے لینے نہ جائیں گے۔ اس کے بعد اگر انھیں اٹھا کر سینے سے نہ لگا لیا جاتا تو اور کیا کیا جاتا؟ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی معافی کا ذکر ایسے شفقت بھرے الفاظ میں فرماتا ہے کہ ہم ان کی طرف پلٹے تاکہ وہ ہماری طرف پلٹ آئیں۔ ان چند لفظوں میں اس کیفیت کی تصویر کھینچی گئی ہے کہ آقا نے پہلے تو ان سے نظر پھیر لی تھی مگر جب وہ بھاگے نہیں بلکہ دل شکستہ ہو کر اسی کے دروازے پر پڑے رہے تو ان کی شان وفاداری پر آقا کو خود ان پر پیار آگیا اور وہ جوش محبت سے بے قرار ہو کر وہ آپ نکل آیا کہ انھیں دوڑ کر سینے سے لگا لے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔ مدینہ کے باشندوں اور گرد و نواح کے بدویوں کو یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنے اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے۔ اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں، اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں، اور کسی دشمن سے (عداوت حق کا) کوئی انتقام وہ لیں اور اس کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کبھی نہ ہوگا کہ (راہ خدا میں) تھوڑا یا بہت کوئی خرچ وہ اٹھائیں اور (سعی جہاد میں) کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ لیا جائے تاکہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے۔

اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔[1]

---

[1] اس آیت کا منشا سمجھنے کے لیے رکوع ۱۲ کی وہ آیت پیش نظر رکھنی چاہیے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کی حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔"

وہاں صرف اتنی بات بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا تھا کہ دارالاسلام کی دیہاتی آبادی کا بیشتر حصہ مرض نفاق میں مبتلا ہے کیونکہ یہ سارے کے سارے لوگ جہالت میں پڑے ہوئے ہیں اور علم کے مرکز سے وابستہ نہ ہونے اور اہل علم کی صحبت میسر نہ آنے کی وجہ سے اللہ کے دین کی حدود ان کو معلوم نہیں ہیں۔ اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ دیہاتی آبادیوں کو اس حالت میں پڑا رہنے دیا جائے بلکہ ان کی جہالت کو دور کرنے اور ان کے اندر شعور اسلامی پیدا کرنے کا اب باقاعدہ انتظام ہونا چاہیے۔ اس غرض کے لیے یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ تمام دیہاتی عرب اپنے اپنے گھروں سے نکل نکل کر مدینے آجائیں اور یہاں علم حاصل کریں۔ اس کے بجائے ہونا یہ چاہیے کہ ہر دیہاتی علاقے اور ہر بستی اور قبیلے سے چند آدمی نکل کر علم کے مرکزوں، مثلاً مدینے اور مکے اور ایسے ہی دوسرے مقامات میں آئیں اور یہاں دین کی سمجھ پیدا کریں، پھر اپنی اپنی بستیوں میں واپس جائیں اور عامۃ الناس کے اندر بیداری

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) پھیلانے کی کوشش کریں۔

یہ ایک نہایت اہم ہدایت تھی جو تحریک اسلامی کو مستحکم کرنے کے لیے ٹھیک موقع پر دی گئی۔ ابتدا میں جبکہ اسلام عرب میں بالکل نیا نیا تھا اور انتہائی شدید مخالفت کے ماحول میں آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا، اس ہدایت کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیونکہ اس وقت تو اسلام قبول کرتا ہی وہ شخص تھا جو پوری طرح اسے سمجھ لیتا تھا اور ہر پہلو سے اس کو جانچ پرکھ کر مطمئن ہو جاتا تھا۔ مگر جب یہ تحریک کامیابی کے مرحلوں میں داخل ہوئی اور زمین میں اس کا اقتدار قائم ہو گیا تو آبادیاں کی آبادیاں فوج در فوج اس میں شامل ہونے لگیں جن کے اندر کم لوگ ایسے تھے جو اسلام کو اس کے تمام مقتضیات کے ساتھ سمجھ بوجھ کر اس پر ایمان لاتے تھے، ورنہ بیشتر لوگ بعض وقت کے سیلاب میں غیر شعوری طور پر بہے چلے آ رہے تھے۔ نو مسلم آبادی کا یہ تیز رفتار پھیلاؤ بظاہر تو اسلام کے لیے سبب قوت تھا، کیونکہ پیروان اسلام کی تعداد بڑھ رہی تھی، لیکن فی الحقیقت اسلامی نظام کے لیے ایسی آبادی کسی کام کی نہ تھی بلکہ الٹی نقصان دہ تھی جو شعور اسلامی سے خالی ہو اور اس نظام کے اخلاقی مطالبات پورے کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ چنانچہ یہ نقصان غزوۂ تبوک کی تیاری کے موقع پر کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اسی لیے عین موقع پر اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی کہ تحریک اسلامی کی یہ توسیع جس رفتار کے ساتھ ہو رہی ہے اسی کے مطابق اس کے استحکام کی تدبیر بھی ہونی چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ ہر حصہ آبادی میں سے چند لوگوں کو لے کر تعلیم و تربیت دی جائے، پھر وہ اپنے اپنے علاقوں میں واپس جا کر عوام کی تعلیم و تربیت کا فرض انجام دیں یہاں تک کہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں اسلام کا شعور اور حدود اللہ کا علم پھیل جائے۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ تعلیم عمومی کے جس انتظام کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے اس کا اصل مقصد عامۃ الناس کو خواندہ بنانا اور ان میں کتاب خوانی کی نوعیت کا علم پھیلانا نہ تھا، بلکہ واضح طور پر اس کا مقصد حقیقی یہ متعین کیا گیا کہ لوگوں میں دین کی سمجھ پیدا ہو اور ان کو اس حد تک ہوشیار و خبردار کر دیا جائے کہ وہ غیر مسلمانہ رویۂ زندگی سے بچنے لگیں۔ یہ مسلمانوں کی تعلیم کا وہ مقصد ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرما دیا ہے اور ہر تعلیمی نظام کو اسی لحاظ سے جانچا جائے گا کہ وہ اس مقصد کو کہاں تک پورا کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام لوگوں میں نوشت و خواند اور کتاب خوانی اور دنیوی علوم کی واقفیت پھیلانا نہیں چاہتا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام لوگوں میں ایسی تعلیم پھیلانا چاہتا ہے جو اوپر کے خط کشیدہ مقصد تک پہنچاتی ہو ورنہ ایک ایک شخص اگر اپنے وقت کا آئن سٹائن اور فرائڈ ہو جائے لیکن دین کے فہم سے عاری اور غیر مسلمانہ رویۂ زندگی میں بھٹکا ہوا ہو تو اسلام ایسی تعلیم پر لعنت بھیجتا ہے۔

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تمہارے پاس ہیں[۱۲۵]، اور چاہیے کہ وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) اس آیت میں لفظ لیتفقھوا فی الدین جو استعمال ہوا ہے اس سے بعد کے لوگوں میں ایک عجیب غلط فہمی پیدا ہو گئی جس کے زہریلے اثرات ایک مدت سے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم بلکہ ان کی مذہبی زندگی پر بھی بری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو تفقہ فی الدین کو تعلیم کا مقصود بتایا تھا جس کے معنی ہیں دین کو سمجھنا، اس کے نظام میں بصیرت حاصل کرنا، اس کے مزاج اور اس کی روح سے آشنا ہونا اور اس قابل ہو جانا کہ فکر و عمل کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے میں انسان یہ جان سکے کہ کونسا طریق فکر اور کونسا طرز عمل روح دین کے مطابق ہے۔ لیکن آگے چل کر جو قانونی علم اصطلاحاً فقہ کے نام سے موسوم ہوا اور جو رفتہ رفتہ اسلامی زندگی کی محض صورت (بمقابلہ روح) کا تفصیلی علم بن کر رہ گیا، لوگوں نے اشتراک لفظی کی بنا پر سمجھ لیا کہ بس یہی وہ چیز ہے جس کا حاصل کرنا حکم الٰہی کے مطابق تعلیم کا منتہائے مقصود ہے، حالانکہ وہ کل مقصود نہیں بلکہ محض ایک جزو مقصود تھا۔ اس عظیم الشان غلط فہمی سے جو نقصانات دین اور پیروان دین کو پہنچے ان کا جائزہ لینے کے لیے تو ایک کتاب کی وسعت درکار ہے، مگر یہاں ہم اس پر متنبہ کرنے کے لیے مختصراً اتنا اشارہ کیے دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو جس چیز نے روح دین سے خالی کر کے محض جسم دین اور شکل دین کی تشریح (Anatomy) پر مرتکز کر دیا، اور بالآخر جس چیز کی بدولت مسلمانوں کی زندگی میں ایک نری بے جان ظاہر داری (Formalism) دین داری کی آخری منزل بن کر رہ گئی، وہ بڑی حد تک یہی غلط فہمی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا[۱۲۵]) عام طور پر مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ اس آیت میں رومیوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا تھا کیونکہ اس وقت اسلامی سرحد سے متصل رومی کفار ہی کا علاقہ تھا۔ لیکن ہمیں اس تفسیر سے اختلاف ہے، کیونکہ اس کے بعد کی ساری تقریر منافقین سے متعلق ہے۔ سیاق کلام پر غور کرنے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہاں کفار سے مراد وہ منافق لوگ ہیں جن کا انکار حق پوری طرح نمایاں ہو چکا تھا اور جن کے اسلامی سوسائٹی میں خلط ملط رہنے سے سخت نقصانات پہنچ رہے تھے۔ رکوع ۱۰ کی ابتدا میں بھی، جہاں سے اس سلسلۂ تقریر کا آغاز ہوا تھا، پہلی بات یہی کہی گئی تھی کہ اب ان آستین کے سانپوں کا استیصال کرنے کے لیے باقاعدہ جہاد شروع کر دیا جائے۔ وہی بات اب تقریر کے اختتام پر تاکید کے لیے پھر دہرائی گئی ہے تاکہ مسلمان اس کی اہمیت کو محسوس کریں اور ان منافقوں کے معاملہ میں اُن نسلی و نسبی اور معاشرتی تعلقات کا لحاظ نہ کریں جو اُن کے اور ان کے درمیان وابستگی کے موجب بنے ہوئے تھے۔ وہاں ان کے خلاف "جہاد" کرنے کا حکم دیا گیا تھا، یہاں اس سے شدید تر لفظ "قتال" استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ان کا پوری طرح قلع قمع کر دیا جائے، کوئی کسر ان کی سرکوبی میں اٹھا نہ رکھی جائے۔ وہاں "کفار" اور "منافق" دو الگ لفظ

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

تمہارے اندر سختی پائیں[۱۲۱]، اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے[۱۲۲]۔ جب کوئی نئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ (مذاق کے طور پر مسلمانوں سے) پوچھتے ہیں کہ "کہو، تم میں سے کس کے ایمان میں اس سے اضافہ ہوا؟" (اس کا جواب یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں تو فی الواقع (ہر نازل ہونے والی سورت نے) اضافہ ہی کیا ہے اور وہ اس سے دل شاد ہیں، البتہ جن لوگوں کے دلوں کو (نفاق کا) روگ لگا ہوا تھا اُن کی سابق نجاست پر (ہر نئی سورت نے) ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا[۱۲۳] اور وہ مرتے دم تک کفر ہی میں مبتلا رہے۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ یہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں؟[۱۲۴] مگر اس پر بھی نہ توبہ کرتے ہیں نہ کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱) رہ گئے تھے۔ یہاں ایک ہی لفظ "کفار" پر اکتفا کیا گیا ہے، تاکہ ان لوگوں کا انکار حق، جو صریح طور پر ثابت ہو چکا تھا، ان کے ظاہری اقرار ایمان کے پردے میں چھپ کر کسی رعایت کا مستحق نہ سمجھ لیا جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۲۱ یعنی اب وہ نرم سلوک ختم ہو جانا چاہیے جو اب تک ان کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ یہی بات رکوع ۱۰ کی ابتدا میں کہی گئی تھی کہ واغلظ علیہم (ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ)۔

۱۲۲ اس تنبیہ کے دو مطلب ہیں اور دونوں یکساں طور پر مراد بھی ہیں۔ ایک یہ کہ ان منکرین حق کے معاملے میں اگر تم نے اپنے شخصی اور خاندانی اور معاشی تعلقات کا لحاظ کیا تو یہ حرکت تقویٰ کے خلاف ہوگی، کیونکہ متقی ہونا اور خدا کے دشمنوں سے لاگ لگائے رکھنا دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، لہٰذا خدا کی مدد اپنے شامل حال رکھنا چاہتے ہو تو اس لاگ لپیٹ سے پاک رہو۔ دوسرے یہ کہ یہ سختی اور جنگ کا جو حکم دیا جا رہا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے ساتھ سختی کرنے میں اخلاق و انسانیت کی بھی ساری حدیں توڑ ڈالی جائیں۔ حدود اللہ کی نگہداشت تو بہرحال تمہاری ہر کارروائی میں ملحوظ رہنی ہی چاہیے۔ اس کو اگر تم نے چھوڑ دیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تمہارا ساتھ چھوڑ دے۔

۱۲۳ ایمان اور کفر و نفاق میں کمی بیشی کا کیا مفہوم ہے اس مسئلے پر ہم سورۂ انفال رکوع اول کے حواشی میں روشنی ڈال چکے ہیں۔

۱۲۴ یعنی کوئی سال ایسا نہیں گزر رہا ہے جبکہ ایک دو مرتبہ ایسے حالات نہ پیش آجاتے ہوں جن میں ان کا دعوائے ایمان آزمائش کی کسوٹی پر کسا نہ جاتا ہو اور اس کی کھوٹ کا راز فاش نہ ہو جاتا ہو۔ کبھی قرآن میں کوئی ایسا حکم آجاتا ہے جس سے ان کی خواہشات نفس پر کوئی نئی پابندی عائد ہو جاتی ہے، کبھی دین کا کوئی ایسا مطالبہ سامنے آجاتا ہے جس سے ان کے مفاد پر ضرب پڑتی ہے، کبھی کوئی اندرونی قضیہ ایسا رونما ہو جاتا ہے جس میں یہ امتحان مضمر ہوتا ہے کہ ان کو اپنے دنیوی تعلقات ... اپنی شخصی و خاندانی اور قبائلی دلچسپیوں

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

سبق لیتے ہیں۔ جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے، پھر چپکے سے نکل بھاگتے ہیں[۱۲۵]۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیے ہیں کیونکہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں[۱۲۶]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) کی بہ نسبت خدا اور اس کا رسول اور اس کا دین کس قدر عزیز ہے۔ کبھی کوئی جنگ ایسی پیش آجاتی ہے جس میں یہ آزمائش ہوتی ہے کہ یہ جس دین پر ایمان لانے کا دعویٰ کر رہے ہیں اس کی خاطر جان، مال، وقت اور محنت کا کتنا ایثار کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ایسے تمام مواقع پر صرف یہی نہیں کہ منافقت کی وہ گندگی جو ان کے جھوٹے اقرار کے نیچے چھپی ہوئی ہے کھل کر منظر عام پر آجاتی ہے، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جب یہ ایمان کے تقاضوں سے منہ موڑ کر بھاگتے ہیں تو ان کے نفاق کی گندگی پہلے سے کچھ زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۲۵؎ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی سورہ نازل ہوتی تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے اجتماع کا اعلان کراتے اور پھر مجمع عام میں اس سورہ کو خطبے کے طور پر سناتے تھے۔ اس محفل میں اہل ایمان کا حال تو یہ ہوتا تھا کہ ہمہ تن گوش ہو کر اس خطبہ کو سنتے اور اس میں مستغرق ہو جاتے تھے، لیکن منافقین کا رنگ ڈھنگ کچھ اور تھا۔ وہ آتو اس لیے جاتے تھے کہ حاضری کا حکم تھا اور اجتماع میں شریک نہ ہونے کے معنی اپنی منافقت کا راز خود فاش کر دینے کے تھے۔ مگر اس خطبے سے ان کو کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ نہایت بددلی کے ساتھ اکتائے ہوئے بیٹھے رہتے تھے اور اپنے آپ کو حاضرین میں شمار کرا لینے کے بعد انہیں بس یہ فکر لگی رہتی تھی کہ کسی طرح جلدی سے جلدی یہاں سے بھاگ نکلیں۔ ان کی اسی حالت کی تصویر یہاں کھینچی گئی ہے۔

۱۲۶؎ یعنی یہ بے وقوف لوگ اپنے مفاد کو نہیں سمجھتے۔ اپنی فلاح سے غافل اور اپنی بہتری سے بے فکر ہیں۔ ان کو احساس نہیں ہے کہ کتنی بڑی نعمت ہے جو اس قرآن اور اس پیغمبر کے ذریعہ سے ان کو دی جا رہی ہے۔ اپنی چھوٹی سی دنیا اور اس کی نہایت گھٹیا قسم کی دلچسپیوں میں یہ کنوئیں کے مینڈک ایسے مگن ہیں کہ اس عظیم الشان علم اور اس زبردست رہنمائی کی قدر و قیمت ان کی سمجھ میں نہیں آتی جس کی بدولت یہ ظلمت سے نکل کے اس تنگ و تاریک گوشے سے اٹھ کر تمام عالم انسانی کے امام و پیشوا بن سکتے ہیں اور اس فانی دنیا ہی میں نہیں بلکہ بعد کی لازوال ابدی زندگی میں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرفراز ہو سکتے ہیں۔ اس نادانی و حماقت کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اللہ نے انہیں استفادہ کی توفیق سے محروم کر دیا ہے۔ جب فلاح و کامرانی، اور قوت و عظمت کا یہ خزانہ مفت لٹ رہا ہوتا ہے اور خوش نصیب لوگ اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہوتے ہیں، اس وقت ان بدنصیبوں کے دل کسی اور طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انہیں خبر تک نہیں ہوتی کہ کس دولت سے محروم رہ گئے۔

دیکھو، تم لوگوں کے پاس ایک ایسا رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔
اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبیؐ ان سے کہہ دو کہ "میرے لیے اللہ بس کرتا ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہ، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ مالک ہے عرش عظیم کا"۔

جماعتِ اسلامی کا دوسرا کل ہند سالانہ اجتماع

تمام ارکان اور ہمدردان جماعت مطلع ہوں کہ جماعت اسلامی کا آئندہ کل ہند سالانہ اجتماع بمقام کانپور (یو، پی) آغاز اپریل سنہ ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوگا۔ تاریخوں کا عنقریب فیصلہ کرکے مفصل اعلان معہ ہدایات رسالہ ہٰذا اور اخبار کوثر لاہور میں شائع کردیا جائے گا۔

اس اجتماع میں تمام ارکان جماعت کی شرکت لازم ہوگی الّا یہ کہ کسی کو عذر شرعی مانع ہو۔ غیر ارکان جماعت جو ہمارے کام سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اسکو سمجھنے اور قریب سے دیکھنے کے خواہشمند ہوں یا کچھ شکوک و شبہات رکھتے ہوں وہ بھی تشریف لاسکتے ہیں بلکہ ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ضرور شریک اجتماع ہوں۔

اس اجتماع سے فارغ ہوکر امیر جماعت ایک وفد کے ساتھ جنوبی ہند کے دورہ کیلئے تشریف لے جائیں گے۔ تاکہ مدراس میں سالانہ اجتماع منعقد کرنے کے جو مقاصد پیش نظر تھے وہ بھی بطریق احسن پورے ہوسکیں۔

نوٹ: (۱) تمام جماعتوں اور ارکان کو چاہیے کہ اپنے تبلیغ و اشاعت کے کام کی رفتار کو تیز تر کردیں اور یوپی کی جماعتیں اور ارکان بالخصوص سرگرمی سے کام لیں تاکہ اجتماع تک زیادہ سے زیادہ لوگوں تک ہماری آواز پہنچ جائے اور اس اجتماع سے یوپی کے لوگ خاطر خواہ استفادہ کرسکیں۔

(۲) مختلف جماعتیں اور منفرد ارکان انتظامی حیثیت سے اپنا جائزہ لے کر مرکز کو مطلع کریں کہ کون کون لوگ اجتماع کے انتظام کے لیے رضاکارانہ اپنی خدمات پیش کرسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف انہی لوگوں کے نام آنے چاہئیں جو فی الواقع انتظامی صلاحیت یا تجربہ رکھتے ہوں اور اجتماع سے تین چار روز پہلے کانپور پہنچ سکیں اور دو تین دن بعد تک ٹھہر سکیں۔ ہر شخص کے ساتھ اس امر کی بھی تشریح درج کردینی چاہیے کہ وہ کس کام کے لیے موزوں ہوگا۔ کام مختلف نوعیتوں کے ہوں گے مثلاً:

(۱) مہمانوں کا استقبال کرنا اور ان کو متعین اقامت گاہوں پر پہنچانا۔ (۲) سامان کی باربرداری کا انتظام۔ (۳) کیمپوں کو نصب کرانا اور متعلقہ امور۔ (۴) روشنی کا انتظام۔ (۵) صفائی کا انتظام۔ (۶) کھانا پکوانا اور کھلانا (اس کام کے لیے زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہوگی)

ممکن ہے کہ ایک دو آدمیوں کو اجتماع سے پندرہ بیس روز یا ایک ماہ پہلے یہاں مرکز میں بلانا پڑے۔

یہ اطلاعات ۱۵ جنوری سنہ ۴۶ء تک آجانی چاہئیں۔

خاکسار
طفیل محمد، قیم جماعت اسلامی، دارالاسلام
پٹھانکوٹ

مقالات

مقتضیات ایمان

جناب مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری

ایمان کیا ہے اور ایمان والوں سے اللہ نے قرآن میں کن امور کے مطالبے کیے ہیں، عام انسانوں میں سے جو صحیح فطرت، صالح طبیعت، کامل فہم رکھنے والی خوش قسمت ہستیاں اسلام کی دعوت کو دل وجان سے مان لیں ان پر اللہ کی طرف سے کیا ذمہ داریاں ڈالی جاتی ہیں زندگی کے تمام شعبوں میں کس نوع کی تبدیلیاں ان سے مطلوب ہوتی ہیں اور وہ کون کون سی پابندیاں ہیں جو اس ایمانی سیرت والے گروہ پر عائد کی جاتی ہیں: اس مضمون میں ان ضروری سوالوں کے جواب میں چند مضبوط دلیلیں قرآن ہی سے پیش کی جائیں گی اور ان مقتضیات ایمان کو نمایاں کیا جائے گا جو علمی موشگافیوں اور متکلمانہ طرز کی جدلی بحثوں سے الگ تھلگ رہ کر صاف صاف سیدھے طریقہ پر قرآن کی منصوص تصریحوں سے معلوم ہوتی ہیں اور جو دین قیم کی بے آمیز اور بے احتمال محکمات ہیں، اور اسلام کی اصولی حقیقتیں، بنیادی صداقتیں انہی پر مبنی ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کی طرف اللہ کے آخری پیغمبر کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں اور آپ کو وہ آخری مستند ہدایت نامہ قرآن کی شکل میں دے دیا گیا ہے جس میں انسانی زندگی کی تمام حسی، عقلی اور وجدانی ضرورتیں پوری کردی گئی ہیں۔ کوئی شعبۂ حیات ایسا نہیں رہا جس کے متعلق کسی چیز کو یونہی تشنہ چھوڑ دیا گیا ہو۔ اور رسول کی بعثت کا مقصد حقیقی یہ بتا دیا گیا ہے کہ وہ دین حق کو جنس دین کی ہر چیز پر غالب کرے، اللہ کے نظام اطاعت کا تمام انسانوں کو اس طرح پورا پورا مطیع اور تابع بنا دے کہ اس دائرہ سے آزاد اور بذات خود مستقل کوئی دوسری اطاعت باقی رہنے ہی نہ پائے۔

اس سچی دعوت کے نتیجے میں انسانی دنیا چند گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو رسول

کے لائے ہوئے قانونِ ہدایت اور دینِ حق کو اپنی ساری زندگی کا واحد دستورِ عمل مان لیتا ہے اور ہر گوشہ میں اسی کی تابعداری، فرماں پذیری، اور بے چون وچرا اطاعت کرتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو بالکل اس کے مقابل و اس کی منکر ہوتا ہے، نہایت جرأت و بے باکی کے ساتھ صاف صاف انکار کر دیتا ہے اور عین اس کے مدمقابل کسی دوسری بنیاد پر حیاتِ انسانی کی تعمیر میں لگ جاتا ہے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو ان دونوں پہلوؤں سے ہٹ کر تیسرا رویہ اختیار کرتا ہے، یعنی دینِ حق کے ساتھ اس حد تک تعلق تو بظاہر پیدا کر لیتا ہے کہ چند معاشرتی اور دنیوی رسموں کی یکسانی اور معاشیاتی نفع اندوزی تک اقرارِ حق کرتا ہے تاکہ دنیوی مفاد محفوظ ہو جائے۔ مگر باطن میں اسکو قانونِ ہدایت سے کوئی لگاؤ، کوئی جوڑ اور کوئی مناسبت نہیں ہوتی، بلکہ زندگی کے بعض مرحلوں میں اس کی حالت منکروں سے بھی زیادہ خراب اور صریح دشمنوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ پوری اسلامی سوسائٹی باوجود ان کے ظاہری موافقانہ رویہ کے صاف ان کا باطن ان کے کردار میں جھلکتا دیکھ لیتی ہے۔

اس طرح ایمان کی نوعیتیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ ایک وہ ایمان جس پر صرف دنیا میں اسلامی قانون کے ظاہری احکام کا اطلاق جاری ہو جاتا ہے اور جان ومال کی حفاظت، اور کچھ اجتماعی و اقتصادی حقوق اور سیاسی مراعات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ وہ ایمان نہیں ہے۔ جو اللہ کی خوشنودی، آخرت میں بہترین جزا، نجاتِ ابدی اور حیاتِ سرمدی کا سبب بن جائے جس پر اللہ کی میزانِ قدر میں درجے حاصل ہوں اور مرتبے اونچے سے اونچے ہوتے چلے جائیں۔ دوسرا حقیقی ایمان جس سے پکا اعتقاد، سچا انقیاد، حقیقی طاعت گزاری، پوری وفاداری، اور کامل بندگی کا ظہور ہوتا ہے اور اسی کے گھٹنے بڑھنے پر انسان کی قدر ومنزلت اللہ کے ہاں گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں ایمان کی زیادتی اور کمی کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ حقیقت میں یہی چیز ہے۔ اور دعوتِ ایمانی سے دراصل یہی چیز مطلوب ہے۔

ذہنی بنیاد ہی ایمانی افتاد ہے آدمیوں کے جتنے کام بھی ہوتے ہیں، وہ دیکھنے میں اگرچہ اعضا وجوارح سے سرزد ہوتے ہیں لیکن ان کا حقیقی منبع اور اصلی مرکز ذہن ہی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ذہنوں کی کیفیتیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ بعض ذہن تو ایسے ہوتے ہیں جن میں کسی خاص قسم کے افکار نہیں ہوتے بلکہ پراگندہ اور منتشر خیالات جم جاتے ہیں، پھر ان سے ظاہر ہونے والے تمام خارجی افعال میں بے ربطی، پراگندگی اور انتشار عیاں ہوتا ہے

اس کے برخلاف دوسری قسم کے ذہن وہ ہوتے ہیں جن میں کوئی عمدہ اور مضبوط عملی فکر موجود ہوتا ہے، جس کا رسوخ و نبات پوری طرح چھایا رہتا ہے، اور اس کے نتیجے کے طور پر جو امور خارجی مظاہر میں نمودار ہوتے رہتے ہیں وہ اتنے ہی راسخ اور ثابت ہوتے ہیں جس قدر ان کا ذہنی پہلو مضبوط ہوتا ہے۔ بہر حال انسانی سیرت کی تشکیل کرنے والی اصل قوت اس کی باطنی کیفیت ہی ہے اور اس کیفیت ہی سے انسانوں کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو ظاہری تکمیل کا سرو سامان کارمہیا ہوتا ہے۔ انسان کے ظاہر میں جو اقوال و افعال، حرکات و سکنات، ظاہر ہوتے رہتے ہیں وہ اصل میں اس کی معنوی استعداد کے نہایت سچے اور حقیقی ترجمان ہوتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ دنیائے انسانی میں اجتماع و تنظیم، اتحاد و اتفاق، ترتیب و ہم آہنگی کے لیے کسی نہ کسی نہایت مضبوط ذہنی بنیاد کی ضرورت پیش آتی ہے، جو ایک طرف انفرادی طور پر ہر فرد میں موجود ہو اور دوسری طرف مجموعی اعتبار سے اجتماعی طور پر پوری جماعتی زندگی میں موجود رہے، ورنہ کسی متحد نظام فکر کا وجود میں آنا ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ "ایمان" اصل میں اسی انقلاب انگیز کیفیت کو کہتے ہیں جو انسان کے اندر صحیح علم و معرفت، فہم و فراست، حکمت و یقین، اور فکر و نظر کے خالص طریقۂ استعمال سے پیدا ہو جاتی ہے، پھر اس سے انسان کے ذہن و دماغ میں ایک خاص قسم کا سلجھاؤ پیدا ہوتا ہے، اور اس کے بعد انسانی فطرت کے اصلی خط و خال نمایاں ہوتے ہیں، اس کے متعلقہ اغراض و مقاصد پورے ہونے شروع ہو جاتے ہیں، انسان اپنے منشائے تخلیق کو اپنے خالق و مالک کی مرضی کے ٹھیک ٹھیک مطابق ادا کرنے لگ جاتا ہے اور اس کا وجود نہ صرف خود اس کے لیے بلکہ پوری نوع انسانی کے لیے اور کل کائنات کے لیے مفید ترین بن جاتا ہے۔

ایمان کی لغوی تحقیق عربی زبان میں لفظ "ایمان" کا اشتقاق "امن" سے ہے۔ چنانچہ اہل لغت کہا کرتے ہیں: "امنہ" یعنی اس کو امن دے دیا۔ اسی معنی کے لحاظ سے قرآن نے بھی کہا ہے "وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ" (اللہ نے انھیں خوف سے امن دیا)۔ "آمن لہ" بھی کہا جاتا ہے یعنی اس کی تصدیق کی اور اس پر بھروسہ کر لیا۔ اور "ایمان" کے معنی پناہ دینے کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ اسی سے اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک نام "مومن" ہے، یعنی اللہ اپنے ان مخلص و موحد بندوں کو اپنے جوار رحمت میں دنیا و آخرت میں پناہ دیتا ہے جو سب سے کٹ کر اس سے جڑ جاتے ہیں، سب سے الگ ہو کر اسی کے ہو رہتے ہیں اور یکسوئی سے اس کو مان لیتے ہیں، پھر کسی غیر اللہ کی پناہ نہیں ڈھونڈتے ہیں۔ غرض یہ کہ قرآن میں لفظ ایمان کا استعمال ان تمام معانی مذکورہ کے لیے کیا گیا ہے۔

اب ایک نظر ان مقامات پر ڈال لی جائے جہاں قرآن نے اس لفظ کا استعمال کیا ہے تاکہ پوری حقیقت آشکارا ہو جائے۔ لفظ "ایمان" کی نسبت ہمیشہ قرآن میں قلب کی طرف کی گئی ہے اور محل ایمان انسان کے دل کو بتایا گیا ہے، اسی لیے جن لوگوں کے دلوں میں حقیقت ایمانی کی پوری اسپرٹ نہیں پیدا ہوئی تھی اور صرف زبانی اقرار و اعتراف کے ذریعہ اہل ایمان کے گروہ میں داخل ہو گئے تھے ان سے صاف صاف کہہ دیا گیا ہے "لَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ" یعنی ابھی تک ایمان تو تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اور ٹھیک ٹھیک ایسا ہی وہاں بھی کہا گیا ہے جہاں حقیقی مومنوں کی مدح فرمائی گئی ہے اور ان کی قلبی حالت کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے فرمایا جاتا ہے کہ "أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ" یعنی یہی تو حقیقی ایمان والے لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش کر دیا ہے اور اپنی طرف سے روح کے ذریعہ ان کی تائید فرمائی ہے۔ اسی طرح قرآن میں ایک مقام پر ان لوگوں کی مذمت فرماتے ہوئے جنھوں نے "قول محض" کا نام ایمان رکھ لیا تھا، ان کی صریح طور پر تردید فرما دی ہے کہ وہ ایمان والے ہیں ہی نہیں کیونکہ قلب جو اصل محل ایمان ہے اس میں تو ایمان ہے ہی نہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ (بقرہ)	اور لوگوں میں سے بعض وہ بھی ہیں جو محض کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لا چکے ہیں حالانکہ وہ سرے سے ایمان لانے والے

قرآن میں ایک دوسری جگہ بھی اسی طرح فرمایا ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِن قُلُوبُهُمْ	وہ لوگ جو محض اپنی زبان سے ایمان لائے ہیں اور ان کے دل تو مومن نہیں ہوئے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن نے ایمان کا اطلاق اصل قلبی حالت پر کیا ہے لہٰذا مجرد زبان سے اقرار و اعتراف کرنا ایمان کا پروانہ نہیں ہے بلکہ وہ بھی اس اعتبار سے قابل لحاظ قرار دیا جاتا ہے کہ انسان اپنے دل کی کیفیت کی ترجمانی زبان ہی سے کیا کرتا ہے، جو شخص اپنی زبان سے کسی بات کے ماننے کا اظہار کرتا ہے تو اس کے بارے میں بظاہر حال یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے جو کچھ کہہ رہا ہے وہی اس کے دل کی مراد اصلی ہوگی ورنہ اصل مقصود تو قلب کی تصدیق ہے۔

قرآن عزیز کو ابتدا سے انتہا تک اسی ایک نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو بالکل اظہر من الشمس ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیائے کرام کے ذریعے انسان سے جس حقیقت کا مطالبہ کیا جارہا ہے وہ ایمان و اعتقاد اور قلبی انقیاد ہے جس کے خارجی عملی مظاہر کا زندگی میں موجود ہونا ناگزیر ہے اور اگر کسی زبانی اقرار کے پشت پر قلبی تصدیق نہ ہو تو اس کا صحیح نام "نفاق" ہے ایمان نہیں ہے۔

اس مقام پر بعض وہ لوگ جو براہ راست قرآن سے اصولی عقائد اخذ کرنے کے بجائے کلامی لٹریچر سے اخذ کرنے کے عادی ہیں یہ کہتے ہیں کہ یہی اہل سنت وجماعت کا عقیدہ ہے کہ اقرار لسانی کافی ہے، حالانکہ یہ مرجیہ کا خیال ہو تو ہو لیکن یہ نہ تو "سنت" سے ماخوذ ہے اور نہ اس بنیاد پر کوئی صحیح اسلامی "جماعت" بن سکتی ہے اور جب ان تفلسف آمیز خیالات کے پرستاروں سے کہا جاتا ہے کہ ایمان کے حقیقی اور واقعی مقتضیات وہ ہیں جن کی طرف قرآن نے اہل ایمان کو پرزور اسالیب بیان کے ساتھ توجہ دلائی ہے اور بار بار انہی کی طرف حکمت و موعظت حسنہ سے دعوت دی گئی ہے اور جگہ جگہ مناسبت مقام سے انہی کی تذکیر و یاددہانی کرائی جاتی ہے تو ناک بھوں چڑھا کر اس کو مسلک "خوارج" بتایا جاتا ہے، حالانکہ اہل سنت وجماعت اسی گروہ کا نام ہے جو اس افراط و تفریط سے بچکر اور خوارج و مرجیہ کے مسلکوں سے ہٹ کر متوازن اور معتدل مسلک ایمانی اختیار کرتا ہے جو عین حق و صواب اور صراط مستقیم ہے۔ افسوس ہے کہ اس روح لطیف تک انہی مجادلانہ بحثوں نے رسائی نہ حاصل ہونے دی اور ان لوگوں کو اُن "مقتضیات ایمان" سے غافل کر رکھا ہے جو کلامی طریقوں سے علیحدہ مجرد قرآنی تفکر و تدبر اور عمیق درس و مطالعہ سے حاصل ہو سکتے تھے۔ قانونی اور عدالتی "ایمان" اور "شہادت گاہ الفت" کے خالص، بے آمیز اور حقیقی ایمان کے فرق و امتیاز کو ان کی ذہنیتوں نے محسوس ہی نہ کیا اور جدل و مخالفت کی گرم بازاری نے انکو باریک احساسات کے ادراک ہی سے محروم کر دیا ہے۔

ایک عرصۂ دراز سے عام طور پر عامیوں سے لے کر اچھے خاصے استعداد و قابلیت رکھنے والے عالموں تک میں یہ بات پھیلی ہوئی ہے کہ "مقتضیات ایمان" اگرچہ کسی مسلمان میں پوری پوری نہ ہوں لیکن وہ چند انفرادی اخلاقی خصوصیات میں ممتاز ہو جائے تو یہ مومن ہو جانے کی کافی ضمانت ہے اور اگر چند نوافل و تطوعات، اذکار و اوراد کا پابند ہو جائے تو پھر اس کے "مومن کامل" ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی، کیونکہ "مقتضیات ایمان"

موجودہ دورِ اجتماعی میں جب کہ گرد و پیش کی دنیا میں کفر، شرک، بدعت، معصیت، غفلت اور جاہلیت کا دور دورہ ہے، حصولِ ایمان کے لیے ایمانی خصائص و لوازم اور پوری علامتوں کا ہونا چنداں ضروری نہیں، اور ایسے غیر اسلامی احوال میں "مقتضیاتِ ایمان" کے لیے کسی اجتماعی جدوجہد اور تبلیغی دعوت کی کوئی خاص تکلیفِ شرعی نہیں ہے، اور اگر اس کو باقاعدہ منظم طریق پر ایک تحریک کی شکل میں جاری کیا جائے تاکہ ایمان داری ایک انفرادی رویہ ہی بن کر جامد و ساکن نہ رہ جائے بلکہ اجتماعی صورت میں ایماندارانہ رویہ ایک جامع دستورِ حیاتِ انسانی بن جائے اور انسانیتِ عامہ کی موجودہ مشکلات کو اسی روشنی میں حل کر کے دعوتِ عام دی جائے تو یہ سعی و کوشش بعض "اہلِ تقویٰ" تک کو کھٹک جاتی ہے اور وہ اس میں مادیت کے جراثیم دیکھنے لگتے ہیں اور روحانی حیثیت سے اس تحریک کو خالی پاتے ہیں، اور "مقتضیاتِ ایمان" سے صاف کترا جاتے ہیں اور بات کو ضمنی و فروعی بحثوں میں الجھا کر رکھ دیتے ہیں، اور اس طرح اللہ کے بندوں کو ایک اور تھپکی مل جاتی ہے کہ وہ ایمانیات کو بیدار کرنے سے غافل ہو جائیں۔

دراصل انہی غلط فہمیوں کی وجہ سے دینِ حق کو عالمگیر مسائلِ حیاتِ انسانی کے واحد حل کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرنے اور بالآخر اس کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے زمین میں قائم کرنے کا فریضہ ادا نہیں ہونے پاتا۔ جمود و تعطل، زاویہ نشینی، عافیت کوشی، خلوت گزینی، کم ہمتی، شکستگی، فرسودگی اور قدامت پرستانہ طور طریق کے ساتھ چند اعمال کی مخصوص شکلوں اور ان کی ظاہری اور تنگی ہی کو تقویٰ، تدین، خشیت، للہیت اور ایمانداری سمجھا جانے لگا ہے۔ اضطرار کے حیلوں بہانوں سے کفر و الحاد اور زندقہ و شیطنت کے زیرِ سایہ تھوڑی سی ایمانداری پر قناعت کر لی جاتی ہے۔ اور تزکیہ و اصلاحِ خلق کا جو کچھ بھی کام کیا جاتا ہے اس کا حاصل اس سے زیادہ کچھ نہیں نکلتا کہ جو طاغوت بھی مسلط ہو چکا ہو اس کو اپنا کام چلانے کے لیے اسلامی اصلاح خانوں سے اچھے خاصے نیکی و خدا ترسی کے مجسمے اور سچائی و دیانت کے عملی نمونے سدھے سدھائے بنے بنائے ملتے چلے جاتے ہیں جو نہایت اخلاص و وفاکیشی، جاں نثاری و تن دہی اور راستبازی و امانت کے ساتھ ان اہلِ باطل کی ہر قسم کی خدمتیں بلا زحمت انجام دیئے چلے جاتے ہیں، اور ان خداوندانِ باطل کی خدائی کے قیام و بقا میں خود ان کے اپنے بنائے ہوئے آدمیوں سے زیادہ مفید و معین ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ دینداری

اور یہ دینی تربیت اقامت حق کے بجائے اقامت باطل میں، اور اللہ کی زمین کو عدل و قسط کے بجائے عدوان و بغاوت اور منکرات و معاصی سے معمور کرنے میں کام آتی ہے۔

ان حالات میں ہم نہایت ضروری سمجھتے ہیں کہ مقتضیات ایمان کو صاف صاف کھول کر بیان کیا جائے اور قانونی و فقہی ایمان کے مقابلہ میں حقیقی معیاری ایمان کے فرق کو واضح و مبرہن کر دیا جائے تاکہ دین کی اجتماعی دعوت کے لیے حقیقی اہل ایمان کی ایک کارگر اور مضبوط جتھہ بندی ہو سکے۔ اس گئی گذری حالت میں بھی بہت سے صالح افراد امت ایسے پائے جاتے ہیں جن میں یقین و ایمان کا اعلیٰ مرتبہ تو موجود ہے لیکن وہ یہ دیکھ کر کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ان کے ایمانی تقاضے کے مطابق جدوجہد نہیں ہو رہی ہے، محض باطل و اہل باطل سے منقطع ہو کر اپنے گوشوں میں منتظر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی بعض بعض باتوں سے کبھی کبھی یہ نمایاں ہو جاتا ہے کہ کوئی اہل عزیمت گروہ اُس کام کے لیے جو عین اُن کے قلب و ضمیر کا مدعا ہے اٹھے تو وہ بھی اس کے ساتھ ہو لیں گے، اور اللہ کی دی ہوئی ان طاقتوں کو جو انھوں نے باطل کی تمام راہوں سے بچا کر رکھی ہیں، اور پوری احتیاط سے الگ تھلگ رہ کر ان کی حفاظت کی ہے، اپنے اصل مقصود کی راہ میں استعمال کریں گے۔ ایسے ہی سچے اور راست باز لوگ دراصل ہمارے صحیح مخاطب ہیں اور انہی کی توجہات کو ادھر منعطف کرانا ہمیں مطلوب ہے۔

فقیہوں کے بیان کردہ "ایمان" اور اللہ کی میزان قدر میں قابل اعتبار "ایمان" میں بڑا ہی عجیب و غریب فرق ہے۔ قانونی مرتبہ میں دلوں کا حال نہیں دیکھا جاتا اور ہرگز دیکھا بھی نہیں جا سکتا، بلکہ زبانی اقرار اور پھر اس اقرار کو درست ثابت کرنے والی چند نشانیوں کو بظاہر دیکھ بھال کر ایک سرسری فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی انسان نے پانچوں ایمانیات کو مان لینے کا زبانی اقرار کر لیا اور ان کو نباہنے کے لیے جو کم سے کم شرطیں اسلامی شریعت میں لازمی قرار دی گئی ہیں انھیں بھی پورا کر دکھلایا تو اس سے دل کے اقرار کا بھی ایک حد تک ثبوت بہم پہنچ جاتا ہے، لہٰذا قانوناً ایسے شخص کو مومن قرار دیا جائے گا اور تہذیب و معاشرت، تمدن و اجتماع کے وہ حقوق جو اسلامی سوسائٹی میں ایک فرد کو حاصل ہونے چاہئیں وہ سب اس کو حاصل ہو جائیں گے۔ نکاح، مصاہرت، وراثت وغیرہ شرعی تعلقات اس کے ساتھ اسلامی احکام و مسائل کے مطابق رکھے جائیں گے۔ لیکن عالم مجازات میں

اللہ کے غضب وجلال اور عذاب جہنم کی مصیبتوں سے نجات پالینا، نعیم اخروی اور فردوس کی جزاء خیر سے متمتع ہونا، اللہ کی رضا وخوشنودی سے فائز المرام ہونا اور اس کے خصوصی مقبول بارگاہ بندوں میں شامل ہونا اس زبان کے محض ہلا دینے پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان دل سے اللہ کے آگے جھک جائے، اپنے ظاہر وباطن کی تمام طاقتوں کو اسی کی مرضیات پر پوری طرح لگا دے، اپنے نفس کی تمام ناجائز خواہشوں پر تشریعی بریک لگا کر ان کی پوری روک تھام کر ڈالے اور تمام اندرونی وبیرونی مزاحمتوں کے مقابلے میں رغبت وپسندیدگی کے ساتھ اللہ کی عبودیت وبندگی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہوجائے۔ یہی تمام انبیائے کرام کی تعلیمات اور الٰہی شریعتوں میں معیاری مطلوب رہا ہے۔ اسی میں انسان کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ جو اس مقام پر امتحان وآزمائش میں کامیاب نہ ہو وہ ایک حد تک تو اسلامی سوسائٹی کو کچھ مغالطہ میں ڈال سکتا ہے لیکن اگر یہ سوسائٹی ایک ساکن وجامد قوم نہ ہو بلکہ اسلام کے اصل مقصود کے لیے جدوجہد کرنے والی ایک فعال جماعت ہو تو اس کی جدوجہد کے مختلف مرحلوں میں خود بخود ایسے مواقع پیش آتے چلے جاتے ہیں جہاں طیب وخبیث اور مخلص ومنافق کا فرق نمایاں ہوجاتا ہے، صالح عنصر سے غیر صالح عنصر چھٹ کر الگ ہوجاتا ہے اور جماعت کے جو افراد قیادت ورہنمائی اور کارکنی وکار فرمائی کرنے والے ہیں وہ جان پہچان لیتے ہیں کہ کون کس مرتبہ کا صاحب ایمان واخلاص ہے، یہاں تک کہ وہ موقع بھی آجاتا ہے جب تمام امت پر واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام کی خاطر جان ومال کے ہر نقصان کو برداشت کرنے والے خاص لوگ کون ہیں اور اسلام کے آڑے وقتوں میں جی چرانے والے کون۔ اس کے بعد وہ غیر مخلص مومنین جو مقتضیات ایمان کو ٹھیک بجا لانے سے قاصر ہوتے ہیں، اور دین حق کی راہ میں اس کے دشمنوں سے بڑھ کر مزاحمتوں، مشکلوں اور رکاوٹوں کا باعث بن جاتے ہیں، وہ صاف صاف پوری مسلم سوسائٹی پر نمایاں ہوجاتے ہیں، ان کی قدر ومنزلت عام طور پر دلوں میں گھٹ جاتی ہے، ان سے غلظت وشدت کا وہ برتاؤ ہونے لگتا ہے کہ وہ یہاں سے بھاگ کر یا تو کافروں میں جا ملتے ہیں یا کم سے کم جماعتی شر وفساد سے اللہ اسلام کو بچا لیتا ہے اور نور حق کا اتمام ہوجاتا ہے۔

وہ کون سے ایمانیات ہیں جو زندگی کے صحیح محرک ہیں

اللہ نے اپنے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انسانی دنیا کے نام اپنا آخری کامل اور مکمل پیغام روانہ فرمایا اور اس کو حیات انسانی کے

کے تمام گوشوں میں بروئے کار لانے کے لیے چند ایمانیات مقرر فرمائے ہیں اور ان کو بار بار دل نشین طرز بیان، روح و ضمیر کو وجد میں لانے والے اسلوب ادا کے ساتھ پیش فرمایا ہے۔ کیونکہ اگر یہ مضبوط بنیادوں پر مستحکم ہو جائیں تو انسانی زندگی کی تعمیر نو الٰہی نقشہ پر ہو سکے گی۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان ایمانیات کی تشریح کر دی جائے اور اس ترتیب سے ان کو پیش کیا جائے جس ترتیب سے وہ قرآن میں وارد ہوئی ہیں۔

قرآن نے جس پرزور طریق پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اسی شدت کے ساتھ ان امور کو بھی پیش کیا ہے جن پر ایقان و اذعان کے بغیر اس راستے میں ایک قدم آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ البتہ جہاں جس چیز پر زور دینا تھا وہاں اسی کو پوری شدت سے ذکر کیا ہے اور دوسری چیز کو کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھا ہے۔ صرف بعض مقامات ایسے ہیں جہاں سارے ایمانیات کو یکجا بیان کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس دور کے بعض تجدد پسند مفسرین قرآن نے دانستہ یا نادانستہ قرآن کے ایسے مقامات سے غلط نتائج نکال لیے ہیں اس لیے مقتضیات ایمان کے بیان میں ان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ضروری ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ تمام اجزائے ایمان کا ایسا کُل بنتا ہے کہ یا تو سب کو مجموعی طور پر رد کیا جائے یا قبول کیا جائے تو پھر سارا کا سارا ہی قبول کرنا ہوگا۔ درمیانی کوئی راہ نہیں ہے۔

قرآن ایک جگہ صرف ایمان باللہ کا ذکر کرتا ہے اور اسی کے نتیجے میں دنیا و آخرت کی خوش خبری دیتا ہے، اور صاف بتاتا ہے کہ کامیابی اسی پر منحصر ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (۴۱-۳)	یقیناً جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے پھر استقامت اختیار کی ان پر فرشتے اترتے ہیں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ جو اللہ و آخرت پر ایمان لائے وہ اجر کا مستحق ہے:

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۲-۸)	جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل اختیار کرتے ہیں پس انہی کے لیے ان کا بدلہ ان کے رب کے پاس ہے۔

تیسرے مقام پر اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے کو لازمی قرار دیا ہے اور اسی کی دعوت دی ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا	پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم نے ایمان

وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۳-۰)

وتقویٰ اختیار کرلیا تو تمہارے واسطے بڑا اجر ہوگا۔

چوتھے مقام پر صراحت کی ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لانا ہوگا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۲۴-۹)

ایمان والے تو حقیقت میں وہی ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاچکے ہیں۔

پانچویں مقام پر فرمایا کہ اللہ، رسول اور قرآن تینوں پر ایمان لانا چاہیے:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا (۲۴-۱)

پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے اتارا ہے (یعنی قرآن)

چھٹے مقام پر ارشاد فرمایا کہ چار چیزیں ایمان کے قابل ہیں، قرآن اور قرآن سے قبل کی تمام آسمانی کتابیں اور اللہ اور آخرت:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ...... وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (۴-۲۳)

حقیقی ایمان لانے والے لوگ تو وہی ہیں جو ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو ہم نے تم پر اتاری ہے اور ان کتابوں پر بھی جو تم سے قبل اتاری جاچکی ہیں ...... اور ایمان لانے والے اللہ پر اور آخرت پر۔

ساتویں مقام پر پانچ ایمانیات ارشاد ہوئے ہیں۔ اللہ، فرشتے، الٰہی کتابیں، انبیاء اور آخرت:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (۲-۴۰)

ایمان لائے رسول اور سب ایمان والے اس کتاب پر جو رسول پر اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے، یہ سب ایمان لائے اللہ پر اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر (کہتے ہیں) ہم تفریق نہیں کرتے اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان اور انھوں نے کہا ہم نے سمع وطاعت اختیار کی، تیری مغفرت ہو

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ... اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۲-۲۲)

اور لیکن پورے پورے نیک تو وہ لوگ ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور اللہ کے فرشتوں پر اور اللہ کی کتابوں پر اور تمام نبیوں پر ایمان لائیں...... یہی وہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو پورے پورے تقویٰ والے ہیں۔

آٹھویں مقام پر نہایت تصریح کے ساتھ سلبی و ایجابی دونوں پہلوؤں سے فرمادیا گیا کہ اللہ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن اور پچھلی الٰہی کتابیں، سب پر ایمان لانا ضروری ہے اور اللہ، ملائکہ، الٰہی کتابیں، رسل اور آخرت کا دن، ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی ضلال بعید ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا (نساء ۲۰)	اے ایمان لانے والو! ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول (محمدؐ) پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر اتاری ہے، اور اس کتاب پر بھی جو پہلے اتاری جاچکی ہے، اور جو کوئی اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور آخرت کے دن کا انکار کرے گا وہ تو بہت دور جا بھٹکا ہے۔

ان چند مقامات قرآن سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ ان پانچ امور پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ان اجزا کی تشریح اور ان کے متعلق ایمان کی تفصیلی کیفیت بیان کرنے کے بعد ہم مومنین کے وہ اوصاف و خصائل اور ان تمام علامات ایمان کو جمع کریں گے جو قرآن نے بتائے ہیں، پھر ان آیات قرآنی کو پیش کریں گے جن میں اہل ایمان سے مطالبات کیے گئے ہیں۔

(باقی)

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ)

مترجمہ: جناب مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی

(۲)

اہل الحدیث اور اہل الرائے[1] میں اختلاف کے اسباب

حضرت سعید ابن مسیب، ابراہیم نخعی اور امام زہری کے زمانہ میں، نیز امام مالک اور سفیان ثوری کے عہد میں، اور اس کے بعد بھی، علماء کا ایک گروہ ایسا تھا جو مسائل شرعیہ میں غور و فکر کرتے وقت رائے[1] کے استعمال کو سخت ناپسند کرتا تھا اور ناگزیر ضرورتوں کے ماسوا، فتویٰ دینے اور مسائل کا استنباط کرنے کی کبھی ہمت نہ کرتا تھا۔ ان کی توجہات کا سب سے بڑا مرکز رسول اللہ کی حدیثوں کا بیان کرنا تھا۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا "مجھے یہ گوارا نہیں[2] کہ تمہارے لیے کوئی ایسی چیز حلال کر دوں جس کو اللہ نے تم پر حرام کیا ہے، یا کسی ایسی چیز کو حرام کر دوں جس کو اللہ نے تمہارے لیے حلال کیا ہے"۔ حضرت معاذ ابن جبل کا ارشاد ہے "لوگو! بلا کے نازل ہونے سے پہلے اس کے لیے جلدی[3] نہ مچاؤ، کیونکہ ہر زمانہ میں ایسے مسلمان موجود رہیں گے جو (اپنے وقت کے پیش آمدہ مسائل میں) پوچھنے پر صحیح جواب دے دیا کریں گے"۔ اسی طرح کے اقوال حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے بھی منقول ہیں، جن میں فرضی مسائل میں سوال و جواب

---

[1] "رائے" ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کی تعریف اوپر متن مضمون میں گذر چکی ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ جب تک مجھ کو کسی آیت یا کسی حدیث سے ایک چیز کی حلت یا حرمت معلوم نہ ہو جائے، محض اپنی رائے سے اس کو حلال یا حرام نہیں کہہ سکتا، ورنہ خدشہ ہے کہ کہیں ایسی چیز کو حلال نہ کہہ دوں جو فی الواقع خدا کے نزدیک حرام ہے، یا اس کے برعکس۔

[3] یعنی جو معاملہ حقیقتاً پیش نہ آیا ہو اس کے متعلق سوال نہ کرو۔ قبل از مرگ واویلا سخت بے عقلی کی بات ہے۔ (مترجم)

کو کروہ قرار دیا گیا ہے جضرت ابن عمرؓ نے حضرت جابر ابن زید سے فرمایا کہ "تم بصرہ کے فقہا میں سے ہو، دیکھو! جو فتویٰ بھی دینا، قرآن ناطق یا سنت جاریہ ہی سے دینا، اگر تم نے اس کے خلاف کیا تو خود بھی ہلاک ہوگے اور دوسروں کو بھی ہلاک کروگے۔" ابو نصر کہتے ہیں کہ "جب حضرت ابو سلمہ بصرہ تشریف لائے تو میں اور حسن بصری ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، انھوں نے حسن بصری سے فرمایا، آپ ہی حسن ہیں؟ بصرہ میں آپ سے زیادہ کسی کی ملاقات کا مجھے شوق نہ تھا جس کا سبب یہ ہے کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہیں، سو ایسا نہ کیجیے، فتویٰ صرف سنت رسول سے دیجیے یا اللہ کی اتاری ہوئی کتاب سے"۔

ابن المکندر فرماتے ہیں کہ "عالم، اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان داخل ہوا کرتا ہے، اس کو چاہیے کہ اس (نازک اور پرخطر) مقام سے (صحیح سلامت) نکلنے کی راہ تلاش کرے[۱]"۔ امام شعبی سے سوال کیا گیا کہ "جب آپ لوگوں سے مسائل پوچھے جاتے تھے تو آپ کیا کیا کرتے تھے"؟ امام موصوف نے سائل سے فرمایا کہ "(اچھا ہوا) تم نے بڑے واقف کار ہی سے بات پوچھی (یعنی میں اس بات سے بخوبی واقف ہوں، سو سنو!) ہم کرتے یہ تھے کہ) جب ہم میں سے کسی شخص کو مخاطب کرکے فتویٰ پوچھا جاتا تو وہ اپنے کسی رفیق سے کہتا کہ آپ اس کا جواب دیجیے، پھر وہ دوسرا کسی تیسرے پر اس فرض کو ڈال دیتا۔ یہ سلسلہ یوں ہی آگے چلتا رہتا یہاں تک کہ وہ استفتا پھر گھوم کر پہلے ہی شخص کے پاس آپہنچتا"۔ یہی امام شعبی ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ "یہ لوگ (یعنی فتویٰ دینے والے) جو کچھ رسول اللہ صلعم کی طرف سے تم کو سنائیں، اس کو لے لو، اور جو کچھ اپنی رائے سے کہیں اسے مزبلہ پر پھینک دو"۔ —— ان تمام آثار کو امام دارمی نے نقل کیا ہے۔

تدوین حدیث کا دور: ان اسباب اور حالات کے ماتحت اسلامی ممالک میں احادیث رسول اللہ اقوال صحابہ کے اکٹھا کرنے اور رسالوں اور کتابوں میں انھیں لکھ لینے کا رواج اتنا عام ہوگیا کہ شاید ہی کوئی

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ عالم شرع کی ذمہ داریاں سخت نازک ہیں۔ وہ اللہ اور بندوں کے درمیان کا واسطہ ہوا کرتا ہے جس کے ذریعہ سے بندوں کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات کا علم ہوتا ہے۔ پس اگر کسی عالم نے اپنی اس گراں ذمہ داری کی ادائگی میں سہل نگاری سے کام لیا اور احکام شرع کی تبیین و تبلیغ میں اپنے ذاتی رجحانات کو دخل دیا تو بدترین انجام سے دوچار ہوگا۔ اس کو پوری احتیاط اور خدا ترسی کے ساتھ اس نازک ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ (مترجم)

عالم حدیث ایسا باقی بچا ہو جس کے لیے کسی مجموعۂ احادیث یا رسالہ یا کتاب کا موجود ہونا اہم ترین ضرورت نہ قرار پا گیا ہو۔ (یہ ذوق و انہماک شیفتگی کی اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ) علم حدیث کے جو اکابر اس زمانہ میں موجود تھے انھوں نے حجاز، شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان کے باقاعدہ دورے کر کے حدیث کی کتابوں کو جمع کیا، اس کی تصنیفات کا کھوج لگایا اور ان احادیث اور آثار کو بھی ڈھونڈھ نکالنے میں پوری قوت صرف کر دی جو غریب[۵۱] اور نادر تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی کوششوں سے احادیث و آثار کا اتنا بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا جس کی مثال اب تک کی تاریخ علم حدیث میں ناپید تھی، جس کی وجہ سے ان لوگوں کو وہ بات حاصل ہو گئی جو پچھلوں کو نصیب نہ ہو سکی تھی۔ ان حدیثوں کی سندیں اتنی کثرت سے بہم پہنچیں کہ ان میں سے کتنی ہی حدیثیں ایسی تھیں جن کی سندیں سو، بلکہ سو سے بھی اوپر تک جا پہنچی تھیں۔ (اس کثرت اسانید کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ) حدیث کے بعض وہ ٹکڑے، جو ایک سند کی روایت میں مخفی رہ گئے تھے دوسری سند کے ذریعہ روشنی میں آ گئے، اور یہ متعین کرنا آسان ہو گیا کہ کون سی حدیث غریب ہے اور کون سی مشہور۔ پھر یہ بھی کہ ان علما کے لیے مختلف حدیثوں کے شواہد[۵۲] اور متابعات میں غور و فکر کرنا ممکن ہو گیا اور ان کے دائرہ معلومات میں بے شمار ایسی صحیح اور مستند حدیثیں آ گئیں جن سے اب تک کے اہل فتویٰ بے خبر تھے، چنانچہ بروایت ابن ہمام، امام شافعی نے امام احمد سے صاف فرمایا تھا کہ "آپ لوگ احادیث صحیحہ کے ہم سے زیادہ جاننے والے ہیں، اس لیے آپ کے پاس جو بھی حدیث صحیح ہو مجھ کو بتا دیا کیجیے تاکہ میں اس کی پیروی کا شرف حاصل کر سکوں خواہ وہ حدیث کسی قسم کی ہو، کوفی ہو یا بصری، یا شامی"، اس کی وجہ یہ تھی کہ کتنی ہی صحیح حدیثیں ایسی ہیں جن کے روایت کرنے والے صرف ایک ہی مقام کے لوگ تھے ___ مثلاً وہ غریب حدیثیں جن کو صرف اہل شام بیان کرتے ہیں یا صرف اہل عراق ___ اسی طرح بہتیری حدیثیں ایسی ہیں جن کی روایت صرف ایک خاص خاندان میں محصور ہے۔ مثلاً وہ مجموعہ احادیث جس کو "نسخہ برید" کہا جاتا ہے اور جس کے بیان کرنے والے صرف

---

۵۱ "غریب" اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو صرف ایک راوی بیان کرتا ہے۔

۵۲ ان حدیثوں کو ایک دوسرے کا شاہد کہا جاتا ہے جو مختلف صحابہ سے مختلف راویوں کے ذریعہ روایت ہوئی ہوں مگر مضمون سب کا ایک ہو۔ اور اگر راوی تو مختلف ہوں مگر سب کے سب ایک ہی صحابی سے حدیث بیان کرتے ہوں اور مضمون بھی سب روایتوں کا ایک ہی ہو تو اس طرح کی روایتوں کو ایک دوسرے کا متابع کہا جاتا ہے۔ (مترجم)

برید ہیں جو ابی بردہ سے اور ابی بردہ ابو موسیٰ سے روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ مجموعۂ احادیث جو نسخۂ عمرو بن شعیب کے نام سے مشہور ہے اور جس کے راوی صرف عمرو بن شعیب ہیں جو اپنے باپ سے اور ان کے باپ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں ـــــ دوسری وجہ یہ تھی کہ بعض صحابہ گمنام اور کم حدیثیں جاننے اور بیان کرنے والے تھے جن سے صرف چند لوگ ہی روایتیں لے سکے۔ پس اسی طرح کی حدیثیں تھیں جو عام اہلِ فتویٰ کی نظروں سے اوجھل رہ گئیں۔ (لیکن ان کے بالمقابل اصحاب حدیث کا حال یہ تھا کہ نہ صرف احادیث ہی کا پورا ذخیرہ ان کے سامنے آچکا تھا بلکہ) ایک ایک بستی کے فقہائے صحابہ و تابعین کے آثار ان کے پاس جمع ہوگئے درانحالیکہ ان سے پہلے ایک شخص صرف ان روایتوں کو جمع کر سکتا تھا جو اس کے اپنے اہل شہر اور اپنے شیوخ کے توسط سے مل سکتی تھیں۔ (پھر ایک دوسرا فرق عظیم یہ تھا کہ) اب تک راویوں کے نام اور ان کے مراتب عدالت[1] سے واقفیت کا سارا دارومدار حالات اور قرائن کے اس سرسری مشاہدہ پر تھا جو بالعموم نگاہِ انسانی کو حاصل ہوا کرتا ہے۔ لیکن اب اس گروہ نے اس فن میں پوری طرح دادِ تحقیق دے کر اس کو تصنیف و تالیف اور بحث و تمحیص کا ایک مستقل موضوع بنا دیا اور بحث کر کر کے اس کے عیب و صواب وغیرہ کا فیصلہ کیا۔ اس تصنیفی اور تحقیقی جد و جہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ احادیث پر سے ابہام کے وہ پردے اٹھ گئے جن کے نیچے ان کے اتصال[2] یا انقطاع کی حقیقتیں پوشیدہ تھیں۔ (اور صریحی طور پر معلوم ہوگیا کہ کون سی حدیث متصل ہے اور کونسی منقطع)۔ چنانچہ امام سفیان ثوری اور وکیع اور ان کی طرح کے دوسرے خادمانِ علم حدیث نے (جمع حدیث میں) سرتوڑ کوششیں کیں مگر اس کے باوجود ایک ہزار بھی متصل اور مرفوع احادیث نہ جمع کر سکے، جیسا کہ ابوداؤد سجستانی کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے جو اہل مکہ کے نام لکھا گیا تھا۔ اس طبقہ کے لوگوں کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد مجموعی طور پر چالیس ہزار یا اس کے لگ بھگ پہنچتی ہے (باقی کو انھوں نے تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر متروک اور ناقابل قبول قرار دیدیا)۔ امام بخاری سے تو یہاں تک

---

[1] "عدالت" اصول حدیث کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد یہ ہے کہ راوی عاقل بالغ مسلمان ہو۔ فسق اور بے حیائی وغیرہ عیوب سے پاک ہو۔ ثقاہت سے گری ہوئی حرکتیں نہ کرتا ہو۔

[2] اتصال کا مطلب یہ ہے کہ سند حدیث میں تمام راویوں کا نام مذکور ہو۔ اور "انقطاع" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی راوی چھوٹ گیا ہو۔

مروی ہے۔ اور بروایت صحیح مروی ہے۔ کہ انھوں نے اپنی کتاب "صحیح بخاری" کو چھ لاکھ حدیثوں سے انتخاب کرکے مرتب کیا۔ اسی طرح امام ابوداؤد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "سنن ابی داؤد" کو پانچ لاکھ کے ذخیرہ سے چن کر مدون کیا۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی کتاب "مسند احمد بن حنبل" کو ایک میزان کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کیا جس کے ذریعہ حدیث نبوی کی صحت کا وزن معلوم کیا جاسکتا ہو، یعنی جو حدیث اس کتاب کے اندر موجود ہو، وہ تو اپنی واقعی بنیاد رکھتی ہے، اگرچہ صرف ایک ہی طریقہ سے مروی ہو، اور جو حدیث اس میں نہ پائی جاسکے اس کے متعلق سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بالکل بے اصل ہے۔

ان علمائے حدیث میں (جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے) عبدالرحمٰن ابن مہدی، یحییٰ ابن سعید قطان، یزید ابن ہارون، عبدالرزاق، ابوبکر ابن ابی شَیبہ، مُسَدَّد، ہَنّاد، احمد ابن حنبل، اسحٰق ابن رَاہُوَیہ، فضل ابن دکین اور علی ابن مَدِینی اور انہی کے ہم پلہ کچھ اور بزرگوں کے اسمائے گرامی نمایاں حیثیت کے مالک ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا طبقہ طبقات محدثین کا سرعنوان ہے۔ ان میں سے وہ، جو تحقیق و تدبر کی نعمت سے سرفراز تھے، فن روایت کو باقاعدہ اور مستحکم کرنے اور مراتب حدیث کی پوری واقفیت بہم پہنچا لینے کے بعد فقہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ سو اس بارے میں ان کی یہ رائے نہ ہوسکی کہ گزشتہ ائمہ فقہ میں سے کسی خاص شخص کی تقلید پر اتفاق کرلیا جائے، جبکہ وہ اپنی آنکھوں ایسی احادیث اور آثار دیکھ رہے تھے جو کہ گرد و پیش پھیلے ہوئے تمام فقہی مذاہب کے (کتنے ہی مسائل میں) صریح مخالف تھے۔ اس لیے انھوں نے احادیث رسول اور آثار صحابہ و تابعین اور اقوال مجتہدین سب پر تحقیق و تجسس کی نگاہ ڈالنی شروع کی جس کے لیے ان کے ذہنوں میں کچھ پختہ اصول متعین تھے۔ ہم اس موقع پر ان اصولوں کا ایک اجمالی تذکرہ کیے دیتے ہیں۔

علمائے حدیث کے اصول استنباط مسائل

مسائل کے بارے میں ان کا دستور یہ تھا:

اگر کسی مسئلہ میں قرآن کچھ (صراحت کے ساتھ) کہہ رہا ہے تو اس وقت ارشاد قرآنی سے منہ پھیر کر کسی اور شے کی طرف جانا جائز نہیں۔

اگر فرمودۂ قرآنی (اپنے مفہوم میں بالکل واضح اور صریح نہ ہو بلکہ) مختلف پہلوؤں کا احتمال رکھتا ہو

تو حدیث نبوی کو ایک پہلو کی تعیین کے لیے حکم بنایا جائے گا۔

جب کسی مسئلہ کے متعلق قرآن کو بالکل خاموش پاتے اس وقت یہ لوگ حدیث رسول کو اختیار کرتے خواہ یہ حدیث مشہور ہو اور فقہا کے درمیان قبول عام کا مقام رکھتی ہو یا (اس کے برعکس) اس کی شہرت اور اس سے واقفیت کا دائرہ کسی ایک شہر یا ایک خاندان یا ایک سلسلۂ روایت تک محدود ہو، یا صحابہ اور فقہاء نے عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ غرض جب کوئی حدیث موجود ہوتی تو اس کے سامنے اس کے مخالف کسی اثر یا کسی مجتہد کے اجتہاد کو کوئی اہمیت نہ دی جاتی۔

پھر جب کسی مسئلہ کے متعلق یہ لوگ انتہائی جستجو کے باوجود کوئی حدیث نہ پاتے تو صحابہ اور تابعین کی کسی ایک جماعت کے اقوال کو لے لیتے۔ (لیکن یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ) اس باب میں ان لوگوں کا یہ دستور نہ تھا کہ دوسرے تمام صحابہ و تابعین کو چھوڑ کر ہر مسئلہ میں کسی ایک ہی مخصوص جماعت یا کسی خاص شہر کے اہل علم کے اقوال کو یہ حیثیت دی جاتی جیسا کہ اس سے پہلے کے اہل فقہ کا چلن تھا۔ (بلکہ ان کا قاعدہ یہ تھا کہ) اگر کسی مسئلہ میں جمہور فقہا اور تمام خلفائے راشدین کو ایک رائے پر متفق پاتے تو اس رائے کو بلاچون و چرا تسلیم کر لیتے۔ اور اگر ان میں باہم دگر اختلاف نظر آتا تو اس صورت میں اس شخص کی بات کو ترجیح دیتے جو علم، خدا ترسی اور ضبط احادیث کے لحاظ سے سب میں اونچا ہوتا، یا پھر ان اقوال میں سے اس قول کو اختیار کرتے جو زیادہ مشہور ہوتا۔ اور اگر کوئی مسئلہ ایسا پاتے جس میں دو برابر کے قول ہوتے تو وہ ان کے نزدیک "دو قولوں والا مسئلہ" کہلاتا (اور ہر قول یکساں قابل اتباع ہوتا)۔

لیکن جب یہ انتہائی کوشش بھی ناکام ہو جاتی (اور صحابہ و تابعین کے اقوال میں بھی ان کو کسی مسئلہ کا جواب نہ ملتا) تو نصوص کتاب و سنت کے عموم، ان کے اشارات، اور ان کے مقتضیات میں غور و خوض کرتے اور مسئلہ کے نظائر کو اس پر محمول کر کے جواب معلوم کرتے بشرطیکہ مسئلہ اور نظیر مسئلہ میں ظاہری طور پر مماثلت نظر آتی۔ اس باب میں وہ کچھ لگے بندھے اصولوں کی غلامی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا سارا انحصار اور اعتماد محض اپنی فہم اور طمانیت قلب پر ہوتا تھا، جیسے کہ کسی حدیث کے متواتر ہونے کا فیصلہ کرنے والی میزان راویوں کی کوئی تعداد اور ان کی عدالت کی نوعیت نہیں ہے بلکہ وہ یقین ہے جو سامعین حدیث کے دلوں میں پیدا

حدیث (کو اس کے تمام سلسلوں کے ساتھ سننے) کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ صحابہ کے احوال بیان کرتے وقت ہم بتا چکے ہیں۔

ان اصولوں کا ماخذ علمائے حدیث کے یہ اصول و قواعد، جن کا اوپر ذکر ہوا، سلف کے طریق فکر و عمل اور ان کی واضح تصریحات سے ماخوذ تھے۔ میمون ابن مہران کہتے ہیں کہ:

"جب کوئی شخص حضرت ابوبکرؓ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرتا تو فیصلہ کے لیے قرآن کو بنظر غائر دیکھتے۔ اگر وہاں کوئی ہدایت موجود ملتی تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا اور اس معاملہ کے متعلق کوئی حدیث ان کے اپنے علم میں ہوتی تو اسی کو اپنے فیصلہ کی بنیاد قرار دیتے۔ لیکن جب اپنا ذخیرہ احادیث اس معاملہ میں رہنمائی کرنے سے انکار کر دیتا تو پھر باہر تشریف لاتے اور عام مسلمانوں سے پوچھتے، میرے سامنے فلاں معاملہ پیش ہوا ہے کیا تم میں سے کسی کو اس طرح کے معاملہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ معلوم ہے؟ تو بسا اوقات آپ کے ارد گرد لوگوں کی ایک معقول تعداد جمع ہو جاتی اور ہر شخص رسول اللہ صلعم کا فیصلہ بیان کرتا، جس کو سن کر حضرت صدیق اکبرؓ فرماتے کہ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے ہمارے اندر ایسے افراد پیدا کیے ہیں جو ہمارے پیغمبر کے ارشادات محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ اور جب اپنی امکانی کوششیں صرف کرنے کے باوجود حضرت موصوف کو کوئی حدیث رسول نہ ملتی تو سربرآوردہ اور بہترین دل و دماغ رکھنے والے افراد کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے، اور جب وہ سب کسی رائے پر اتفاق کر لیتے تو اسی کے مطابق آپ اپنا فیصلہ صادر فرماتے۔"

اسی طرح حضرت عمرؓ کے متعلق قاضی شُریح کی روایت ہے کہ:

"انھوں نے (یعنی حضرت عمرؓ نے) ان کے پاس (یعنی قاضی شریح کے پاس) فرمان بھیجا تھا کہ اگر تمھارے پاس کوئی ایسا معاملہ آئے جس کا حکم اللہ کی کتاب میں موجود ہو تو اسی کے مطابق فیصلہ کرو۔ خبردار! زید و بکر کی رائیں اس کی طرف سے تمھاری توجہ نہ ہٹائیں۔ اور اگر کوئی ایسا معاملہ تمھاری عدالت میں پیش ہو جس کے بارے میں کتاب الٰہی کوئی حکم نہ دے رہی ہو تو سنت رسول کو دیکھو اور اس کی رہنمائی میں فیصلہ کرو۔ لیکن اگر کسی معاملہ میں نہ کتاب الٰہی کا کوئی حکم موجود ہو نہ ہی سنت کا، تو پھر

یہ دیکھو کہ جمہور کا اتفاق اس قسم کے معاملہ میں کس چیز پر ہے (اگر کوئی متفق علیہ رائے مل جائے تو) اسی کو اپنے فیصلہ کے لیے اختیار کر لو۔ اور اگر یہ صورت پیش آجائے کہ کتاب الٰہی میں معاملہ کا کوئی فیصلہ نہ ملے، سنت نبوی بھی خاموش ہو اور اس بارے میں اپنے کسی پیشرو کا کوئی قول بھی تم کو نہ دستیاب ہو سکے تو دو باتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرو، اگر چاہو کہ اپنی رائے سے اجتہاد کر کے فوراً معاملہ کا فیصلہ سنا دو تو ایسا بھی کر سکتے ہو، اور اگر چاہو کہ (اجتہاد کے بعد فیصلہ نافذ کرنے میں) تاخیر اور مزید غور و فکر سے کام لو تو اس کی بھی اجازت ہے، (لیکن جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے) میں تاخیر اور مزید غور و فکر ہی کو تمھارے حق میں بہتر سمجھتا ہوں۔"

حضرت عبد اللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ:

"ایک زمانہ ہم پر ایسا گزرا ہے جب کہ ہم معاملات کا فیصلہ نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اس کے اہل تھے[۵۵]، لیکن اب مشیت ایزدی نے ہم کو اس جگہ لا کھڑا کیا ہے جس کو تم دیکھ رہے ہو، تو سنو! آج کے بعد جس کسی کے سامنے کوئی معاملہ پیش ہو اس کو چاہیے کہ اس معاملہ کا فیصلہ کتاب الٰہی کے مطابق کرے اور اگر کوئی ایسا معاملہ آئے جس کے متعلق کتاب الٰہی میں حکم مذکور نہ ہو تو رسول اللہ صلعم کے فیصلوں پر نظر کرے اور انہی کے بموجب فیصلہ دے، لیکن جب کوئی ایسا معاملہ سامنے آئے جس کے بارے میں نہ تو کتاب الٰہی کچھ کہہ رہی ہو نہ ہی رسول اللہ صلعم کا کوئی فیصلہ معلوم ہو تو علمائے صالحین کے فیصلے کو اختیار کرے[۵۶]، اور اس سلسلہ میں یہ نہ کہے کہ "میں ڈرتا ہوں اور میری رائے یہ ہے" کیونکہ حرام اپنی جگہ واضح ہے اور حلال بھی واضح ہے اور کچھ چیزیں ان کے درمیان ہیں جن کی حلت اور حرمت واضح نہیں، سو (ان چیزوں کے حلال یا حرام قرار دینے میں یہ اصول سامنے رکھو کہ) جو چیز دل میں کھٹکے اس کو چھوڑ دو اور جو ایسی نہ ہو اس کو اختیار کر لو۔"

حضرت ابن عباس سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو اس کے بارے میں اگر قرآن کا کوئی حکم ہوتا تو اسے

---

۵۵ اس زمانہ سے مراد رسول اللہ صلعم کا اور خلفائے راشدین کا زمانہ ہے۔

۵۶ مطلب یہ ہے کہ جب قرآن یا سنت یا اجماع صالحین سے کسی مسئلہ کا حکم معلوم ہو جائے تو خواہ مخواہ اسکے بیان کرنے میں جھجک سے کام نہ لے۔ (مترجم)

بتا دیتے، اور اگر قرآن میں اس کا حکم نہ پاتے اور سنت رسول میں مل جاتا تو وہ سنا دیتے۔ اور جب ان دونوں کو خاموش پاتے تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فیصلوں کو سامنے رکھ کر جواب دیتے۔ لیکن جب یہاں سے بھی کوئی چیز نہ ملتی تو بطور خود اجتہاد کر کے اپنی رائے سے فیصلہ کرتے۔ انہی حضرت ابن عباسؓ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں تنبیہ کی کہ۔

"کیا تمہیں یہ کہتے ہوئے کہ رسول اللہ کا فرمایا یہ ہے اور فلاں شخص کا کہنا یہ ہے[1]، اس امر کا خوف نہیں آتا کہ تم پر عذاب آ دھمکے یا تمھیں زمین میں دھنسا دیا جائے۔"

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ "ابن سیرین نے ایک شخص کو رسول اللہ صلعم کی کوئی حدیث سنائی تو اس نے کہا کہ اس مسئلہ کے متعلق فلاں شخص یہ کہتا ہے۔ ابن سیرین نے جواب دیا کہ میں تجھ کو رسول کریم کی حدیث سناتا ہوں اور تو کہتا ہے کہ فلاں کا قول یہ ہے۔"

امام اوزاعی سے منقول ہے کہ "عمر بن عبدالعزیز نے فرمان صادر کیا تھا کہ کتاب اللہ کے حکم کے سامنے کسی شخص کی رائے کا کوئی وزن نہیں، ائمہ مجتہدین کی رائے صرف اس مسئلہ میں قابل لحاظ ہے جس کے متعلق خدا کی کتاب میں کوئی حکم نہ نازل ہوا ہو اور نہ ہی کوئی ارشاد نبوی وارد ہوا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سنت مقرر فرما دی ہو اس میں کسی شخص کی رائے بال برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔"

اعمش سے روایت ہے کہ "ابراہیم نخعی اس بات کے قائل تھے کہ (مقتدی کو جب کہ وہ تنہا ہو) امام کے بائیں جانب کھڑا ہونا چاہیے۔ میں نے ان کو سمیع زیات کے حوالہ سے حضرت ابن عباس کی یہ روایت سنائی کہ (جب ایک بار نماز تہجد میں وہ آنحضرت صلعم کے بائیں طرف کھڑے ہو گئے تھے تو) آنحضرت صلعم نے ان کو وہاں سے ہٹا کر دائیں طرف کھڑا کر لیا۔ ابراہیم نخعی نے یہ روایت سن کر اپنے خیال سے رجوع کر لیا۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ "امام شعبی کے پاس کوئی آدمی ایک مسئلہ پوچھنے آیا۔ امام موصوف نے جواب دیا کہ "اس مسئلہ میں حضرت عبداللہ ابن مسعود کی رائے یہ ہے۔" اس نے کہا "آپ اپنی رائے بتائیے۔" یہ سن کر امام شعبی نے فرمایا "لوگو! کیا تمھیں اس شخص پر حیرت نہیں ہوتی؟ میں نے تو اس کو ابن مسعود کا فتویٰ بتا دیا اور

[1] یعنی قول رسول کے مقابلہ میں کسی اور کا قول پیش کرنا موجب ہلاکت ہے۔ مترجم

وہ ہے کہ میری رائے پوچھ رہا ہے۔ میں تو اسے طریق جواب کو اپنی ذاتی رائے کے اظہار سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں۔ خدا کی قسم میری زبان سے کسی گیت[1] کا نکلنا مجھے پسند ہے مگر یہ پسند نہیں کہ (ابن مسعود جیسے جلیل القدر صحابی اور واقفِ اسرارِ شریعت کے فتوے کے مقابلہ میں) اس سے اپنی رائے کا اظہار کروں۔"

ان تمام آثار کو دارمی نے نقل کیا ہے۔

اسی طرح امام ترمذی نے ابی سائب کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "ہم لوگ وکیع کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک شخص سے، جو رائے سے کام لینے کے حامی تھا، فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار[2] کیا ہے مگر امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ اشعار مُثلہ ہے"۔ اس شخص نے جواب دیا "اس کی وجہ یہ ہے کہ ابراہیم نخعی نے اشعار کو مثلہ قرار دیا ہے۔" میں نے دیکھا کہ یہ الفاظ سنتے ہی وکیع غصہ سے بیتاب ہو گئے اور فرمایا میں تجھ سے کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے اور تو اس کے مقابلہ میں ابراہیم نخعی کا قول سنا رہا ہے؟ یقیناً تو اس قابل ہے کہ قید میں ڈال دیا جائے اور اس وقت تک باہر نہ نکالا جائے جب تک کہ اپنے اس قول سے رجوع نہ کرلے۔"

حضرت عبداللہ ابن عباس، عطاء، مجاہد اور مالک ابن انس رضی اللہ عنہم فرمایا کرتے تھے کہ "کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کی ہر بات آنکھ بند کرکے مان لی جائے اور جس کی کچھ باتیں قابلِ تسلیم اور کچھ قابلِ رد نہ ہوں بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔"

اس طریق فقہ کی کامیابی

غرض سلف صالحین کے یہ اصول تھے جن کو سامنے رکھ کر علمائے حدیث نے اتباع شریعت اور استنباط مسائل کے مذکورہ بالا قواعد کا تعین کیا۔ پھر جب انھوں نے فقہ کو ان بنیادوں پر مرتب کرکے مسائل پر نظر ڈالی تو ان مسائل میں سے، جن پر پہلے گفتگو ہو چکی تھی یا جو اب ان کے سامنے پیش آ رہے تھے، کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس کے متعلق کوئی نہ کوئی حدیث انھیں نہ مل گئی ہو۔۔۔ خواہ وہ مرفوع اور متصل ہو، خواہ مرسل، خواہ موقوف، صحیح ہو خواہ حسن[3] خواہ کسی اور طرح کی، قابلِ اعتبار ۔۔۔ یا پھر

---

[1] گیت نکلنے سے مراد یہ ہے کہ زبان سے کوئی گندی بات نکل جائے۔ [2] "اشعار" ایک شرعی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قربانی کے اونٹ کی کوہان کو دائیں طرف سے کسی دھار دار آلے کے ذریعہ اس طرح زخمی کر دیا جائے کہ وہ خون میں لت پت ہو جائے۔

[3] "حسن" اصطلاح اصول حدیث میں اس روایت کو کہتے ہیں جس کی سند متصل ہو، شذوذ اور علت سے محفوظ ہو لیکن اس کے راوی حفظ میں کم درجے کے ہوں۔ — مترجم

شاذ و شاذ ہوئی ہیں۔ اور جو حدیثیں بظاہر ایک دوسرے کی مخالف تھیں، ان میں تطبیق بھی دے دی۔ اس طرح اپنی ان مبارک کوششوں کے ذریعہ امام مسلم نے کسی ایسے شخص کے لیے جو زبان عرب سے واقف ہو، سنت کی شاہراہ چھوڑ کر کسی اور طرف جانے کا عذر باقی نہیں رہنے دیا۔

امام ابوداؤد تیسرے بزرگ امام ابوداؤد سجستانی ہیں۔ جن کے سامنے یہ مقصد تھا کہ ان حدیثوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے جو فقہا کا مدار بحث اور ان میں زیادہ مشہور ہیں اور جن پر علماء امصار نے احکام کی بنیاد رکھی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے اپنی کتاب مرتب کی۔ تو اس میں صحیح اور حسن اور وہ ضعیف حدیثیں جمع کیں جو کہ قابل عمل تھیں۔ چنانچہ امام مذکور فرماتے ہیں کہ "میں نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث درج نہیں کی ہے جو تمام علمائے حدیث کے نزدیک قابل ترک ہو۔" پھر جمع حدیث کے ساتھ ساتھ آپ نے ضعیف روایتوں کے ضعف کی تصریح بھی کر دی ہے، اور جن روایتوں میں کوئی علت[1] تھی اس کے بیان میں ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ فن حدیث میں نظر رکھنے والا اس کو اپنی نگاہ تعمق سے بھانپ لے۔ اور (سب پر مستزاد یہ کہ) ہر حدیث بیان کرنے سے پہلے کسی ایک ایسے مسئلہ فقہی کو اس کا عنوان قرار دے دیا ہے جس کو کسی نہ کسی عالم نے اس حدیث سے مستنبط کیا ہو اور جو کسی نہ کسی کا مذہب ہو۔ یہی وجہ ہے امام غزالی وغیرہ کے اس قول کی کہ "ابو داؤد کی کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے۔"

امام ترمذی چوتھے صاحب امام ترمذی ہیں، جن کے متعلق ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک طرف تو تنقیح روایت میں امام بخاری اور مسلم کے طریقہ کو پسند کیا تھا۔ دوسری طرف فقہاء و علماء کے مذاہب جمع کرنے میں امام ابوداؤد کی روش کے گرویدہ تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی کتاب کی تالیف میں ان دونوں ہی خوبیوں کو سمیٹ لیا، مزید برآں یہ بھی کیا کہ صحابہ اور تابعین اور دوسرے فقہائے ملت کے مذاہب بھی بیان کر دیے۔ اس طرح ایک ایسی جامع تصنیف تیار کی جس میں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ حدیث کی مختلف سندوں کا اس طور پر مختصر کیا گیا ہے کہ ایک سند تو ذکر کر دی ہے اور باقی کی طرف صرف اشارے کر دیے ہیں۔ پھر ہر حدیث کے متعلق اس کے صحیح یا حسن، یا ضعیف، یا منکر[2] ہونے کی نیز ضعیف روایتوں کے سبب ضعف کی وضاحت بھی کر دی ہے تاکہ طالب فن کو پوری بصیرت حاصل رہے اور معتبر و غیر معتبر احادیث میں امتیاز کر سکے۔ اس کے ساتھ ہر حدیث کے بارے میں یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ وہ مشہور ہے یا غریب ان سب باتوں کے سوا صحابہ اور فقہائے اسلام کے مذاہب بھی نقل کرتے گئے ہیں اور اس سلسلہ میں حسب ضرورت اسمائے رواۃ کی کنیت بیان کی ہے۔ غرض فن حدیث کے طالب کی بحث کے لیے کوئی حجاب حقیقت اس کتاب میں باقی نہیں رہنے پایا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ "وہ مجتہد کے لیے کفایت اور مقلد کے لیے بس کرتی ہے۔"

(یہ تھے اہل الحدیث۔ اب ان کے بالمقابل اہل الرائے کا گروہ ہے، جن کے طرز فکر و عمل کا ہمیں آگے جائزہ لینا ہے)

(باقی)

---

[1] علت حدیث کے متن یا اس کی سند کے اس نقص کو کہتے ہیں جو صرف تحقیق کی گرفت میں آ سکے۔

[2] "منکر" اس ضعیف حدیث کو کہتے ہیں جو کسی حدیث صحیح یا حسن کی مخالف ہو۔ (مترجم)

رسائل و مسائل

نظامِ کفر کی قانون ساز مجلس میں مسلمانوں کی شرکت کا مسئلہ

سوال:- آپ کی کتاب "اسلام کا نظریہ سیاسی" پڑھنے کے بعد یہ حقیقت تو دلنشین ہوگئی ہے کہ قانون سازی کا حق صرف خدا ہی کے لیے مختص ہے اور اس حقیقت کے مخالف اصولوں پر بنی ہوئی قانون ساز اسمبلیوں کا ممبر بننا عین شریعت کے خلاف ہے۔ مگر ایک شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ اگر تمام مسلمان اسمبلیوں کی شرکت کو حرام تسلیم کریں تو پھر سیاسی حیثیت سے مسلمان تباہ ہوجائیں گے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی قوت ہی سے قوموں کی فلاح و بہبود کا کام کیا جاسکتا ہے اور ہم نے اگر سیاسی قوت کو بالکلیہ غیروں کے حوالے ہوجانے دیا تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ اغیار مسلم دشمنی کی وجہ سے ایسے قوانین نافذ کریں گے اور ایسا نظام مرتب کریں گے جس کے نیچے مسلمان دب کر رہ جائیں، پھر آپ اس سیاسی تباہی سے بچنے کی کیا صورت مسلمانوں کے لیے تجویز کرتے ہیں؟

جواب:- آپ نے اپنے سوال میں سوچنے کا انداز غلط اختیار کیا ہے۔ یہ بات تو آپ کی سمجھ میں آگئی ہے کہ وہ نظام جس میں انسان خود اپنا قانون ساز بنتا ہے یا دوسرے انسانوں کو قانون سازی کا حق دیتا ہے، سرے سے غلط ہے۔ نیز یہ بات بھی آپ سمجھ چکے ہیں کہ امرِ حق یہی ہے کہ حکم صرف اللہ کے لیے ہے اور انسان کا کام اس کے حکم کا اتباع کرنا ہے نہ کہ خود واضعِ حکم بن جانا۔ اب آپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ مسلمان جن کے مفاد کی آپ فکر کر رہے ہیں وہ کس غرض کے لیے "مسلم" نامی ایک جماعت بنائے گئے تھے؟ آیا اس غرض کے لیے کہ وہ اس امرِ حق کو جو قرآن سے ثابت ہے، دنیا کے سامنے پیش کریں، اس کو تسلیم کرائیں، خود اپنی زندگی کو اس پر قائم کریں اور دنیا میں اس کو جاری کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کردیں؟ یا اس غرض کے لیے کہ اس کے بالکل برخلاف جو باطل بھی دنیا میں قائم ہوجائے (اور خود ان کی اپنی غفلتوں کی بدولت قائم ہو) اُس کی موافقت کریں اور اس کو اپنا لیں اور اسے مٹانے کی سعی سے اس لیے گریز کرتے رہیں کہ کہیں ان کے مفاد کو نقصان نہ پہنچ جائے؟

اگر پہلی بات ہے تو مسلمان آج جو کچھ کر رہے ہیں، غلط کر رہے ہیں، اور ان کا مفاد اگر اس غلطی سے وابستہ ہے تو ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس کی پروا کی جائے، اور ایسی صورت حال میں ایک سچے مسلمان کو اپنی قوم کے ساتھ نہ کہ جہنم کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے امر حق کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس کی قوم اس کا ساتھ دے یا نہ دے؛ اور اگر آپ دوسری بات کے قائل ہیں تو پھر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، حق کو حق جاننے کے باوجود خلاف حق طریقہ پر اگر محض قومی مفاد کی خاطر آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔

یہ اندیشہ اکثر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر ہم اسمبلیوں سے پرہیز کریں تو ان پر غیر مسلم قابض ہو کر نظام حکومت کے تنہا مالک و متصرف بن جائیں گے اور اگر نظام باطل کے کل پرزے ہم نہ بنیں تو دوسرے بن جائیں گے اور اس طرح زندگی کے سارے کاروبار پر قابض ہو کر وہ ہماری ہستی ہی کو ختم کر دیں گے، حتیٰ کہ اسلام کا نام لینے والے باقی ہی نہ رہیں گے کہ تم ان سے خطاب کر سکو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اندیشے جتنے ہولناک ہیں اس سے زیادہ خام خیالی کے نمونے ہیں۔ اگر ہم نے یہ کہا ہوتا کہ صرف ایک منفی پالیسی اختیار کر کے مسلمان زندگی کا سارا کاروبار چھوڑ دیں اور گوشوں میں جا بیٹھیں تو یہ اندیشے ضرور کسی حقیقت پر مبنی ہوتے، لیکن ہم اس نفی کے ساتھ ساتھ ایک اثبات بھی تو پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اس نظام کے ساتھ سازگاری کرنے کے بجائے دنیا میں نظام حق قائم کرنے کے لیے منظم سعی شروع کریں اور دوسری قوموں کے ساتھ اپنے دنیوی مفاد کے لیے کشمکش اور مزاحمت کرنے کے بجائے ان کے سامنے وہ دین حق پیش کریں جس کی پیروی میں تمام انسانوں کی فلاح ہے، اور قرآن کے ذریعہ سے، سیرت رسولؐ کے ذریعے سے اور اخلاق اسلامی کے ذریعے سے دنیا میں فکری، اخلاقی، معاشی اور تمدنی اور سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری اس دعوت کے جواب میں دو صورتیں پیش آسکتی ہیں:

ایک یہ کہ تمام ہندوستان کے مسلمان جن کی تعداد دس کروڑ ہے، اور جن کے پاس مادی وسائل اور ذہنی اور دماغی قوتوں اور ہاتھ پاؤں کی طاقتوں کی کمی نہیں ہے، بیک وقت ہماری اس دعوت کو قبول کر لیں اور ذہنی، اخلاقی اور عملی تمام حیثیتوں سے اسلام کے سچے داعی بن جائیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو آپ تو یہ اندیشہ کر رہے ہیں کہ سب کچھ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ ہندوستان

ہی نہیں دنیا کا ایک بڑا حصہ آپ کے ہاتھ آجائے گا، ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کا جھگڑا دیکھتے دیکھتے ختم ہوجائے گا، ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت کو قائم ہونے سے کوئی طاقت نہ روک سکے گی، بہت قلیل مدت کے اندر مسلمان ممالک کی بھی کایا پلٹ جائے گی اور خود وہ قومیں تک جو آج ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہیں، مسخر ہونے سے محفوظ نہ رہ سکیں گی۔

دوسری صورت یہ پیش آسکتی ہے اور یہی اس وقت متوقع بھی ہے کہ مسلمانوں میں سے بتدریج تھوڑی تھوڑی تعداد میں پاک نفس اور اعلیٰ درجہ کے ذہن رکھنے والے لوگ ہماری اس دعوت کو قبول کرتے جائیں گے اور جب تک صالحین کا یہ گروہ منظم ہوکر ایک طاقت نہ بنے، عام مسلمان اپنے لیڈروں کی پیروی میں وہی کچھ کرتے رہیں گے جو ایک مدت سے کرتے آرہے ہیں اور آج کر رہے ہیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہ خطرہ پیش نہیں آسکتا جس کا آپ اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں، کیونکہ غلط کار مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت وہ سارے کام کرنے کے لیے موجود رہے گی جن کے نہ کرنے سے آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا قومی مفاد خاک میں مل جائے گا۔ البتہ اگر یہ سارے کام ہوتے رہیں اور صرف وہی ایک کام نہ ہو جس کی طرف ہم بلا رہے ہیں اور اگر ہم بھی امر حق اور اس کے تقاضوں سے آنکھیں بند کرکے محض قوم اور اس کے مفاد کی فکر میں اُن باطل کاریوں کی طرف دوڑ جائیں جو آج اسلام اور مسلم مفاد کے نام سے ہو رہی ہیں تو یقین رکھیے کہ اسلام کا جھنڈا تو خیر کیا بلند ہوگا، مسلمان قوم اس ذلت و خواری اور اس پستی کے گڑھے سے بھی نہ نکل سکے گی جس میں وہ یہودیوں کی طرح صرف اس لیے مبتلا ہوئی ہے کہ خدا کی کتاب رکھتے ہوئے اس نے اس کتاب کا منشا پورا کرنے سے منہ موڑا۔

مجالسِ قانون ساز کی رکنیت اور نظامِ کفر کی ملازمت شرعی نقطۂ نظر سے

سوال:۔ کیا مسلمان کو بحیثیت مسلمان ہونے کے اسمبلی کی ممبری جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ یہاں مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے نمائندے اسمبلی کی رکنیت کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں اور ان کی طرف سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے مجھ پر بار ڈالا جا رہا ہے، حتیٰ کہ عملاً تگ و دو کا مطالبہ بھی ہے۔ اگرچہ مجملاً جانتا ہوں کہ انسانی حاکمیت کے نظریے پر قائم ہونے والی اسمبلی اور اس کی رکنیت دونوں شریعت کی نگاہ میں ناجائز ہیں، مگر تاوقتیکہ

معقول وجوہ پیش نہ کر سکوں، ووٹ کے مطالبہ سے چھٹکارا پانا دشوار ہے۔

یہ امر بھی دریافت طلب ہے کہ سرکاری ملازمت کی حیثیت کیا ہے؟ اس معاملہ میں بھی سرسری طور پر میری رائے عدم جواز کی طرف مائل ہے مگر واضح دلائل سامنے نہیں ہیں۔

جواب: اسمبلی کے متعلق تو یہ سمجھ لیجیے کہ موجودہ زمانہ میں جتنے جمہوری نظام بنے ہیں (جن کی ایک شاخ ہندوستان کی موجودہ اسمبلیاں بھی ہیں) وہ اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ باشندگان ملک اپنے معاملات کے متعلق خود تمدن، سیاست، معیشت، اخلاق اور معاشرت کے اصول وضع کرنے اور ان سے تفصیلی قوانین وضوابط بنانے کا حق رکھتے ہیں، اور اس قانون سازی کے لیے رائے عام سے بالاتر کسی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نظریہ اسلام کے نظریہ سے بالکل برعکس ہے۔ اسلام میں توحید کے عقیدے کا لازمی جزء یہ ہے کہ لوگوں کا اور تمام دنیا کا مالک اور فرماں روا اللہ تعالیٰ ہے۔ ہدایت اور حکم دینا اس کا کام ہے اور لوگوں کا کام یہ ہے کہ اس کی ہدایت اور اس کے حکم سے اپنے لیے قانون زندگی اخذ کریں، نیز اگر اپنی آزادیٔ رائے اختیار کریں بھی تو ان حدود کے اندر کریں جن حدود میں خود اللہ تعالیٰ نے ان کو آزادی دی ہے۔ اس نظریے کی رو سے قانون کا ماخذ اور تمام معاملات زندگی میں مرجع اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت قرار پاتی ہے، اور اس نظریہ سے ہٹ کر اول الذکر جمہوری نظریے کو قبول کرنا گویا عقیدۂ توحید سے منحرف ہوجانا ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانہ کے جمہوری اصول پر مبنی ہیں ان کی رکنیت حرام ہے۔ اور ان کے لیے ووٹ دینا بھی حرام ہے، کیونکہ ووٹ دینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اپنی رائے سے کسی ایسے شخص کو منتخب کرتے ہیں جس کا کام موجودہ دستور کے تحت وہ قانون سازی کرنا ہے جو عقیدۂ توحید کے سراسر منافی ہے۔ اگر علمائے کرام میں سے کوئی صاحب اس چیز کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں تو ان سے اس کی دلیل دریافت کیجیے۔ اس مسئلہ کی تفصیل اگر آپ سمجھنا چاہیں تو میری کتاب سیاسی کشمکش حصہ سوم اور اسلام کا نظریۂ سیاسی ملاحظہ فرمائیں۔

اس قسم کے معاملات میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ چونکہ یہ نظام مسلط ہوچکا ہے اور زندگی کے سارے معاملات اس سے متعلق ہیں، اس لیے اگر ہم انتخابات میں حصہ نہ لیں اور نظام حکومت میں شریک ہونے کی کوشش نہ کریں تو ہمیں فلاں اور فلاں نقصانات پہنچ جائیں گے۔ ایسے دلائل سے کسی ایسی چیز کو جو اصولاً حرام ہو، حلال ثابت نہیں

کیا جا سکتا، ورنہ شریعت کی کوئی حرام چیز ایسی نہ رہ جائے گی جس کو مصلحتوں اور ضرورتوں کی بنا پر حلال نہ ٹھہرا لیا جائے۔ اضطرار کی بنا پر حرام چیزیں استعمال کرنے کی اجازت شریعت میں پائی تو جاتی ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ خود اپنی غفلتوں سے اپنے فرائض کی ادائگی میں کوتاہی کر کے اضطرار کی حالتیں پیدا کریں، پھر اس اضطرار کو دلیل بنا کر تمام محرمات کو اپنے لیے حلال کرتے جائیں اور اس اضطرار کی حالت کو ختم کرنے کیلئے کوئی کوشش نہ کریں۔ جو نظام اس وقت مسلمانوں پر مسلط ہوا ہے، جس کے تسلط کو وہ اپنے لیے دلیل اضطرار بنا رہے ہیں، وہ آخر ان کی اپنی ہی غفلتوں کا تو نتیجہ ہے۔ پھر اب بجائے اس کے کہ اپنا سرمایۂ قوت و عمل اس نظام کے بدلنے اور خالص اسلامی نظام قائم کرنے کی سعی میں صرف کریں، وہ اس اضطرار کو حجت بنا کر اسی نظام کے اندر حصہ دار بننے اور پھلنے پھولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(۲) دوسری چیز جو آپ نے دریافت کی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ایک فرد مسلم اگر کسی فرد غیر مسلم سے اجرت یا تنخواہ پر کسی خدمت کے ادا کرنے کا معاملہ طے کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ خدمت براہ راست کسی حرام سے متعلق نہ ہو۔ اسی بنیاد پر علما کا ایک بڑا گروہ حکومت کفر کی ملازمت کو جائز ٹھیرانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ لوگ اس فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ایک فرد غیر مسلم کے شخصی کاروبار اور ایک غیر اسلامی نظام کے اجتماعی کاروبار میں اصولاً ہوتا ہے۔ ایک غیر اسلامی نظام تو قائم ہوتا ہی اس غرض کے لیے ہے اور اس کے سارے کاروبار کے اندر ہر حال اور ہر پہلو میں مضمر ہی یہ چیز ہوتی ہے کہ اسلام کے بجائے غیر اسلام، طاعت کے بجائے معصیت اور خلافتِ الٰہی کے بجائے خدا سے بغاوت انسانی زندگی میں کار فرما ہو، اور ظاہر ہے کہ یہ چیز حرام اور تمام محرمات سے بڑھ کر حرام ہے۔ لہٰذا ایسے نظام کو چلانے والے شعبوں میں یہ تفریق نہیں کی جا سکتی کہ فلاں شعبے کا کام جائز نوعیت کا ہے اور فلاں شعبے کا ناجائز، کیونکہ یہ سارے شعبے مل جل کر ایک ہی بڑی معصیت کو قائم کر رہے ہیں۔ اس معاملہ کی ٹھیک ٹھیک نوعیت سمجھنے کیلیے یہ مثال کافی ہوگی کہ اگر کوئی ادارہ اس غرض کے لیے قائم ہو کہ عامۃ الناس میں کفر کی اشاعت کرے اور مسلمانوں کو مرتد بنائے تو اس ادارہ کا کوئی کام اجرت پر کرنا، خواہ وہ کام بجائے خود حلال قسم کا ہو (مگر اس ادارے کی تقویت اور اس کے کام کو فروغ دینے کے لیے بہر حال ناگزیر ہو) کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہو سکتا۔

اس معاملہ میں بھی آخر کار مسلمان اضطرار والی حجت پیش کرنے پر اتر آتے ہیں کہ اگر ہم اس حکومت کی

مشینری میں کل پرزے نہ بنیں گے تو غیر مسلم اس پر قابض ہو جائیں گے اور تمام اقتدار ان کے ہاتھ میں چلا جائے گا لیکن اس کا جواب وہی ہے جو پہلے مسئلہ میں اضطرار کی دلیل پر دیا گیا ہے۔

پر امن انقلاب کا راستہ

سوال :- ذیل میں دو شبہات پیش کرتا ہوں۔ براہِ کرم صحیح نظریات کی توضیح فرما کر انھیں صاف کر دیجیے۔

(۱) ترجمان القرآن کے گزشتہ سے پیوستہ پرچے میں ایک سائل کا سوال شائع ہوا ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک منظم اسٹیٹ تھا اور انھوں نے جب ریاست کو اقتدار کلی منتقل کرنے پر آمادہ پایا تو آگے بڑھ کر قبول کر لیا اور یہ طریق کار اختیار نہیں کیا کہ پہلے مومنین صالحین کی ایک جماعت تیار کریں۔ کیا آج بھی جب کہ اسٹیٹ اس دور سے کئی گنا زیادہ ہمہ گیر ہو چکا ہے، اس قسم کا طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے؟" اس سوال کے جواب میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے مجھے پورا پورا اطمینان نہیں ہوا۔ مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ ہم کو حضرت یوسف علیہ السلام کا اتباع کرنا ہی کیوں چاہیے؟ ہمارے لیے تو صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ واجب الاتباع ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کی بادشاہت کی پیشکش کو رد کر کے اپنے ہی خطوط پر جداگانہ ریاست کی تعمیر و تشکیل کا کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا، اور ہمارے لیے بھی طریق کار اب یہی ہے! واضح فرمائیے کہ میری یہ رائے کس حد تک صحیح یا غلط ہے۔

(۲) آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ کسی مرحلہ پر اگر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقے سے نظام باطل کو اپنے اصول پر ڈھالا جا سکے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہ ہوگا ــــ اس جملے سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ جماعت اسلامی بھی ایک حد تک اسمبلیوں میں آنے کے لیے تیار ہے اور الیکشن کو جائز سمجھتی ہے۔ اس معاملہ میں جماعتی مسلک کی توضیح فرمائیے۔

جواب :- ہمارے لیے سارے انبیاء علیہم السلام واجب الاتباع ہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی ہدایت تھی کہ اسی طریق پر چلیں جو تمام انبیاء کا طریق تھا۔ جب قرآن کے ذریعہ سے ہمیں معلوم ہو جائے کہ کسی معاملہ میں کسی نبی نے کوئی خاص طرز عمل اختیار کیا تھا اور قرآن نے اس طریق کار کو منسوخ بھی نہ قرار دیا ہو

تو وہ ویسا ہی دینی طریق کار ہے جیسا وہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسنون ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بادشاہی پیش کی گئی تھی وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ آپ اس دین کو اور اس کی تبلیغ کو چھوڑ دیں، تو ہم سب مل کر آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے۔ یہ بات اگر یوسف علیہ السلام کے سامنے بھی پیش کی جاتی تو وہ بھی اسی طرح اس پر لعنت بھیجتے جس طرح نبی کریم نے اس پر لعنت بھیجی اور ہم بھی اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو جو اختیارات پیش کیے گئے تھے وہ غیر مشروط اور غیر محدود تھے اور ان کے قبول کر لینے سے حضرت یوسف کو یہ اقتدار حاصل ہو رہا تھا کہ ملک کے نظام کو اس ڈھنگ پر چلائیں جو دین حق کے مطابق ہو۔ یہ چیز اگر نبی کریم کے سامنے پیش کی جاتی تو آپ بھی اسے قبول کر لیتے اور خواہ مخواہ لڑ کر ہی وہ چیز حاصل کرنے پر اصرار نہ کرتے جو بغیر لڑے پیش کی جا رہی ہو۔ اسی طرح کبھی ہم کو اگر یہ توقع ہو کہ ہم رائے عام کی تائید سے نظام حکومت پر اس طرح قابض ہو سکیں گے کہ اس کو خالص اسلامی دستور پر چلا سکیں تو ہمیں بھی اس کے قبول کر لینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

(۳) الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لیے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی (Secular) جمہوری (Democratic) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس طریقہ سے کام نہ لیں۔ جو چیز لڑے بغیر سیدھے طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہو اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہم یہ طریق کار صرف اس صورت میں اختیار کریں گے جبکہ:

اولاً، ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عام کسی نظام کے لیے ہموار ہو جانا ہی عملاً اس نظام کے قائم ہونے کے لیے کافی ہو سکتا ہو۔

ثانیاً، ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگان ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہمخیال بنا چکے ہوں؛ اور غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ثالثاً، انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔

کرب کا علاج بذریعہ موت

سوال:۔ اگر کسی مریض کے جاں بر ہونے کی امید قطعاً ختم ہو چکی ہو اور شدت مرض کی وجہ سے وہ انتہائی کرب میں مبتلا ہو، یہاں تک کہ نہ غذا اندر جا سکتی ہو، نہ دوا، تو کیا ایسے حالات میں کوئی طبیب حاذق اس کو تکلیف سے نجات دلانے کے لیے سنکھیے وغیرہ کا انجکشن دے کر اس کی زندگی کی دردناک گھڑیاں کم کر سکتا ہے؟ اس قسم کی موت وارد کرنے سے کیا اس پر شرعاً قتل کا الزام آئے گا، حالانکہ اس کی نیت بخیر ہے؟

جواب:۔ نہیں یہ صورت جائز نہیں ہے۔ طبیب کو اللہ تعالیٰ نے جو علم دیا ہے اُس کی غرض انسان کی زندگی کے لیے کوشش کرنا ہے نہ کہ اس کی موت کے لیے۔ جب تک کسی شخص کے اندر جان باقی ہے، اس کی زندگی کو قصداً ختم کرنے کی کوشش، خواہ نیت اس کی تکلیفوں کو کم کرنے ہی کی کیوں نہ ہو، قتل عمد ہے۔ یہ کام صرف کفار ہی کے کرنے کا ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جو زندگی اور اس کی تکلیفوں کی حقیقت کو سمجھتا ہے، یہ ہرگز زیبا نہیں ہو سکتا۔

خریدار حضرات سے ایک گذارش

اب رسالہ، ان شاء اللہ، ہر ماہ ٹھیک وقت پر نکلتا رہے گا اور ہر انگریزی مہینہ کی ۲۰ تاریخ کو دفتر سے روانہ کر دیا جائے گا۔ اس لیے جن لوگوں کو مہینہ کی ۳۰ تاریخ تک رسالہ نہ ملے ان کو ایک ہفتہ کے اندر (یعنی اگلے مہینہ کی ساتویں تاریخ تک) ہمیں اطلاع دے دینی چاہیے۔ اس کے بعد شاید تعمیل ارشاد نہ ہو سکے گی۔

"مینجر"

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اِسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے :-

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اُصولوں پر قائم کیجا سکتی ہے۔ ایسا اِقدام کرنے والے گروہ کو کن اُصولوں پر منظم کیا جاسکتا ہے، اور اِن اصولوں پر جس قدر اعتراضات وشبہات کئے جاسکتے ہیں، اُن کا جواب کیا ہے؟ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کردی گئی ہیں :-

قیمت حصہ اول ۱-۱۴-۰۰ حصہ دوم ۲-۸-۰۰ حصہ سوم ۱-۱۲-۰۰

علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ — مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام جمالپور۔ پٹھانکوٹ (پنجاب)